Registered No. L, 4186

صفر ۱۳۶۱ — جلد ۲۰ — عدد ۲

۸۶ء

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت سالانہ صہ — قیمت فی پرچہ ۸ر

خـــالی صفحـــه

فہرست مضامین

صفر سنہ ۶۱ھ (اپریل سنہ ۴۲ء) جلد ۲۰ عدد ۲-

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک
پریس سرکلر روڈ میں طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن،
پونچھ روڈ، مبارک پارک لاہور سے
شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

اشارات

توفیق الٰہی کے اعتماد پر تفہیم القرآن کا جو سلسلہ ان صفحات میں شروع کیا گیا ہے اس کی تکمیل کے بعد ارادہ ہے کہ ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا جائے جس میں ایک عام ناظر کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر اُن تمام امور کی توضیح کر دی جائے جن کا جاننا قرآن مجید کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس دوران میں کہ یہ مسودۂ رسالہ میں شائع ہو رہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ قرآن کے مبادی پر بھی مختصر اشارات ساتھ ساتھ کیے جاتے رہیں تاکہ جو اصحاب اس مسودہ کو بغرض استفادہ دیکھ رہے ہوں ان کے لیے فہم قرآن کی راہ صاف ہوتی رہے، اور ان سوالات کا جواب ساتھ ساتھ ملتا جائے جو کلام اللہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بالعموم ناظرین کے ذہن میں کھٹکتے ہیں۔

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے ابھی تک اجنبی رہا ہے، پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ "کتاب" ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہو گا، پھر اصل مضمون کو ابواب و فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلہ پر بحث کی جائے گی اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبہ کو لے کر اس کے متعلق بھی احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں

اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی اندازِ بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصّے، آثارِ کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں، ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے، ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آجاتا ہے، مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رُخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے، بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں، تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ و مابعد الطبیعیات ہے تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں، انسان اور موجوداتِ عالم کا ذکر ہے تو تعلیم طبیعیات کے طریقہ پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو علومِ عمران کے طرز پر نہیں، قانونی احکام اور اُصولِ قانون کا بیان ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف، اور اخلاق کی تعلیم ہے تو فلسفۂ اخلاق کے سارے لٹریچر سے اس کا انداز جدا۔ یہ سب کچھ اپنے سابق کتابی تصور کے خلاف پاکر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور اُسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر مرتب، غیر مربوط، منتشر کلام ہے جو اول سے لے کر آخر تک بیشمار چھوٹے بڑے مختلف شذرات پر مشتمل ہے مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اسی پر طرح طرح کے اعتراضات کی بنا رکھ دیتا ہے۔ اور موافقانہ نقطۂ نظر رکھنے والا کبھی معنی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے شکوک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس ظاہری بے ترتیبی کی تاویلیں کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے، کبھی مصنوعی طریقہ سے ربط تلاش کر کے عجیب عجیب نتائج نکالتا ہے، اور کبھی "نظریۂ شذرات" کو قبول کر لیتا ہے جس کی وجہ سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر ایسی معنی آفرینیوں کی آماج گاہ بن جاتی ہے جو قائل کے منشأ کے خلاف ہوتی ہیں۔

پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا موضوع معلوم ہو، اس کے مقصد و مدعا اور اس کے مرکزی مضمون کا علم ہو، اس کے اندازِ بیان سے واقفیت ہو، اس کی اصطلاحی زبان اور اس کے مخصوص طرزِ تعبیر سے شناسائی ہو، اور اس کے بیانات اپنی ظاہری عبارت کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلق رکھتے ہوں وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔ عام طور پر جو کتابیں ہم پڑھتے ہیں ان میں یہ چیزیں بآسانی مل جاتی ہیں اس لیے ان کے مضامین کی تہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی بڑی زحمت نہیں ہوتی۔ مگر قرآن میں یہ اُس طرح نہیں ملتیں جس طرح ہم دوسری کتابوں میں انھیں پانے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے ایک عام کتاب خواں کی ذہنیت سے جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے موضوع، مدعا اور مرکزی مضمون کا سراغ نہیں ملتا، اس کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر بھی اسے کچھ اجنبی سا محسوس ہوتا ہے، اور اکثر مقامات پر اس کی عبارات کا پس منظر بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں ان سے کم و بیش مستفید ہونے کے باوجود آدمی کلام اللہ کی اصلی روح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے اور علمِ کتاب حاصل کرنے کے بجائے اس کو کتاب کے محض چند منتشر نکات و فوائد پر قناعت کر لینی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو قرآن کا مطالعہ کر کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کے بھٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فہمِ کتاب کے ان ضروری مبادی سے ناواقف رہتے ہوئے جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو اس کے صفحات پر مختلف مضامین انھیں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، بکثرت آیات کا مطلب اُن پر نہیں کھلتا، بہت سی آیات کو دیکھتے ہیں کہ بجائے خود نورِ حکمت سے جگمگا رہی ہیں مگر سیاقِ عبارت میں بالکل بے جوڑ محسوس ہوتی ہیں، متعدد مقامات پر تعبیرات اور اسلوبِ بیان کی ناواقفیت انھیں اصل مطلب سے ہٹا کر کسی اور ہی طرف لے جاتی ہے، اور اکثر مواقع پر پس منظر کا صحیح علم نہ ہونے سے شدید غلط فہمیاں پیش آتی ہیں۔

قرآن کس قسم کی کتاب ہے، اس کے نزول کی کیفیت اور اس کی ترتیب کی نوعیت کیا ہے، اس کا موضوع گفتگو کیا ہے، اس کی ساری بحث کس مدعا کے لیے ہے، کس مرکزی مضمون کے ساتھ اس کے یہ بے شمار مختلف النوع مضامین وابستہ ہیں، کیا طرزِ استدلال اور کیا طرزِ بیان اس نے اپنے مدعا کے لیے اختیار کیا ہے، یہ اور ایسے ہی دوسرے چند ضروری سوالات ہیں جن کا جواب صاف اور سیدھے طریقہ سے اگر آدمی کو ابتدا ہی میں مل جائے تو وہ بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اس کے لیے فہم و تدبر کی راہیں کشادہ ہو سکتی ہیں۔ عام لوگوں کی مقدرت سے یہ بات خارج ہے کہ وہ برسوں کے غائر مطالعہ اور تلاش و تجسس سے ان سوالات کا جواب خود حاصل کریں۔ دراصل یہ قرآن کے شارحین و مفسرین کا کام ہے کہ وہ اس کتاب پاک کا مطالعہ کرنے والوں کی مشکلات کو سمجھیں اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کریں۔ اب تک زیادہ تر توجہ یا تو ان لوگوں کے مقابلہ پر صرف کی گئی ہے جو قرآن کو مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے شبہات و اعتراضات سے نورِ حق کو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں، یا پھر اُن لوگوں کی ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو پہلے سے ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن اب وہ لوگ ہماری توجہ کے زیادہ مستحق ہیں جو کسی مخالفانہ جذبہ کے بغیر کھلے دل سے قرآن پڑھنے کے لیے تیار ہیں مگر اسے سمجھ کر ایمان اور علمِ حق کی روشنی حاصل کرنا چاہتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ انھیں بہت زیادہ علمی پیچیدگیوں اور محققانہ گہرائیوں کی حاجت نہیں، عام فہم طریقے سے چند مبادی ان کے ذہن نشین کر دینے کی ضرورت ہے تاکہ آگے چل کر انھیں قرآن کے مطالعہ میں کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

جو شخص قرآن میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پاکر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے، اس کی پریشانی کی اصل وجہ وہی ابتدائی غلط فہمی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس نے اس گمان کے ساتھ مطالعہ شروع کیا کہ وہ "مذہب کے موضوع پر ایک کتاب" پڑھنے چلا ہے۔ "مذہب کا موضوع" اور "کتاب"، ان دونوں کا تصور اس کے ذہن میں وہی تھا جو بالعموم "مذہب" اور "کتاب" کے متعلق ذہنوں میں ہوتا ہے۔ مگر جب

وہاں اسے اپنے ذہنی تصور سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پڑا تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہ کر سکا اور سررشتۂ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث اس نے بین السطوریوں بھٹکنا شروع کر دیا جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس گم گشتگی سے بچانے کے لیے اسے پہلے ہی یہ بتا دینا چاہیے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے، اس کی "تصنیف" دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے، اپنے موضوع اور مضمون اور ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ ایک نرالی چیز ہے، لہٰذا تمہارے ذہن کا وہ کتابی سانچہ جواب تک کی کتب بینی سے بنا ہے، اس کتاب کے سمجھنے میں تمہاری مدد نہ کرے گا بلکہ اُلٹا مزاحم ہوگا۔ اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خصوصیات سے شناسائی حاصل کرو۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہو جانا چاہیے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اُس نے اور اس کے پیش کرنے والے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

اللہ عزوجل نے، جو کائنات کا خالق اور مالک و فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصہ میں جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا، اُسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں، فجور اور تقویٰ کی تمیز دی، انتخاب اور ارادے کی آزادی دی، تصرف کے اختیارات بخشے، اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (آٹانومی) دے کر اسے زمین میں خلیفہ بنایا۔ اس تقرر کے ساتھ ہی اللہ نے انسان کو آگاہ کر دیا کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں، میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے، دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیار دے کر بھیجا جا رہا ہے در اصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس

آنا ہوگا۔ تب میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد رب اور الٰہ تسلیم کرو، جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دار الامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلہ میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمہیں دنیا میں امن واطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمہیں ابدی راحت ومسرّت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنّت ہے، اور اگر دوسرے کسی رویّہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے)، تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گذر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج ومصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔ یہ فہمائش کر کے اللہ نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی اور انسانِ اوّل کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق اس نوع کو زمین میں کام کرنا چاہیے تھا۔ مگر رفتہ رفتہ انسان اس ہدایت سے منحرف ہوگئے، صحیح رویّہ کو چھوڑ کر غلط رویّوں پر چل پڑے، یہاں تک کہ جو ہدایت دی گئی تھی اُسے بھی انہوں نے یا تو اپنی غفلت وبے پروائی سے گم کر دیا یا شرارت سے مسخ کر کے اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیا۔ اس کے بعد اللہ مختلف قوموں اور ملکوں میں بار بار اپنے پیغمبر بھیجتا رہا جن کا کام یہ تھا کہ صحیح رویّہ کی طرف انسانوں کو دعوت دیں، جس ہدایت کو انسانوں نے گم یا مسخ کر دیا ہے اُسے پھر اصلی صورت میں پیش کریں، اور انسانوں میں سے جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے خدائی ہدایت کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہوں انھیں منظم کر کے ایسی امت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی بند کرنے کے لیے جد وجہد کرے۔ یہ پیغمبر ہزارہا برس تک دنیا میں آتے رہے، وہی ایک دعوت اور وہی ایک ہدایت پیش کرتے رہے، اور اگر انسانوں کے کسی گروہ نے ان کی دعوت قبول کی تو خدا کے مطیع فرمان (مسلم) بندوں کی وہی ایک امّت بناتے رہے۔ مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے تو اس دعوت کو قبول ہی نہ کیا اور جنھوں نے

قبول کر کے امتِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض امتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔ آخر کار اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیا آتے رہے تھے۔ عام انسان اور پچھلے انبیاء کی بگڑی ہوئی امتیں، سب آپ کے مخاطب تھے[۱]، سب کو صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا، سب کو از سرِ نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں انھیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے ـــــ اسی دعوت و ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس کتاب کے لیے اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ نہ یہ گم ہو سکتی ہے اور نہ مسخ کی جا سکتی ہے۔

قرآن کی یہ اصل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے، اس کا مرکزی مضمون کیا ہے، اور اس کا مدعا کیا ہے۔

اس کا موضوع انسان ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔

اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظامِ کائنات اور اپنی ہستی اور حیاتِ دنیوی کے مآل و انجام کے متعلق جو نظریات قائم کیے ہیں اور ان کی بنا پر جو رویے اختیار کیے ہیں وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجہ کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جسے اوپر "صحیح رویہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

[۱] اگرچہ مخاطب جن بھی ہیں مگر وہ بالتبع مخاطب ہیں۔ اصل مخاطب انسان ہی ہے۔

اس کا مدعا انسان کو صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اُس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

ان تین بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اُسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اول سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جُڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان کی ساخت، انسان کی خلقت، آثارِ کائنات کے مشاہدات، گزری ہوئی قوموں کے واقعات، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید، مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح، اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر کرتا ہے مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبیعات یا تاریخ یا فلسفہ یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے بلکہ اس لیے کہ اسے حقیقتِ نفس الامری کے متعلق مختلف انسانی گروہوں کے تصورات کی تردید کر کے اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، اور خلافِ حقیقت رویہ کی غلطی و بدانجامی واضح کر کے اس رویہ کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابقِ حقیقت اور خوش انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اُس حد تک اور اس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مدعا کے لیے ضروری ہے، ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدرِ ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ "دعوت" کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

مگر قرآن کے طرزِ بیان اور اس کی ترتیب اور اس کے بہت سے مضامین کو آدمی اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اس کی کیفیتِ نزول کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

یہ قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ اسے شائع کر کے لوگوں کو ایک خاص رویۂ زندگی کی طرف بلائیں۔ نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں تجریدی (Abstract) طریقہ پر موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی

ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اسلوب۔ دراصل اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اُسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ سے دعوت کی ابتدا کرے۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں: ایک پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس طرز پر کام کریں۔ دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گرد و پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے ان کا رویہ غلط ہو رہا تھا۔ تیسرے، صحیح رویہ کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے ان بنیادی اصولِ اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح و سعادت ہے۔ شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائی دعوت کی مناسبت سے بہت چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل تھے جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت شیریں، نہایت پُر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے تھی تاکہ دلوں میں یہ بول تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنم کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوں، اور زبانیں ان کے حسنِ تناسب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انھیں دہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جا رہی تھیں عالمگیر صداقتیں مگر ان کے لیے دلائل و شواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی جاتی تھیں جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انہی کی تاریخ، انہی کی روایات، انہی کے روزمرہ مشاہدہ میں آنے والے آثارِ الٰہی کی اعتقادی اور اجتماعی و اخلاقی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

یہ دعوت جو ابتدائی مرحلہ میں دی گئی تھی اس کا ردِ عمل تین صورتوں میں ظاہر ہوا۔ (۱) چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کر کے امتِ مسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔ (۲) ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی یا آبائی طریقہ کی محبت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔ (۳) مکہ اور قریش کی حدود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقہ میں پہنچنے لگی۔ یہاں سے اس دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نہایت پُرجوش خطبوں کی شکل میں پیغامات بھیجنے شروع کیے جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انھیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی گئی، انھیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا شدید جوش و ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ دوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو پچھلی قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں ان کا گزر ہوتا تھا، آثارِ کائنات اور خود ان کی اپنی ہستی سے ان کے نظریات و عقائد کی غلطی اور توحید و معاد اور حسابِ آخرت کی صداقت انھیں سمجھائی گئی، خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا، بُرے اخلاق اور غلط طرزِ زندگی پر انھیں ملامت کی گئی اور بتدریج اللہ کی ہدایت اور صحیح رویۂ زندگی کو زیادہ تفصیلی صورت میں ان کے سامنے پیش کر کے قبولِ حق کی دعوت دی گئی۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جدوجہد اور مزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوع بڑھتا گیا۔

اس کے بعد یہ دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی جس کا آغاز ہجرت سے ہوا۔ اس مرحلے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ پُرانی جاہلیت کے علمبرداروں سے جنگ کی نوبت آئی، پچھلے

انبیاء کی امتوں سے سابقہ پیش آیا۔ خود امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا۔ اور کئی سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار ریاست کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیرنگیں ہوگیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے۔ اس مرحلہ کی بھی مختلف منزلیں تھیں۔ ہر منزل میں اس کی مخصوص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے پیغامات آئے جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا، اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں نبی کو بتایا گیا کہ وہ جماعت اور ریاست اور مدنیت صالحہ کی تعمیر کس طرح کریں، زندگی کے مختلف شعبوں کو کن اصول و ضوابط پر قائم کریں، منافقین اور اہل کتاب اور برسر جنگ یا برسر مسالمت کافروں کے ساتھ ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے کیا معاملہ کریں، اور ایک طرف عالمگیر دعوت و اصلاح کی، دوسری طرف جماعت مسلمین کے سردار کی، اور تیسری طرف رئیس حکومت کی مختلف حیثیتوں میں بیک وقت کس طرح کام کریں۔ مسلمانوں کو زندگی کے مختلف معاملات و احوال میں صحیح طرز عمل کی تفصیلی ہدایت دی گئی، ان کی کمزوریوں پر تنبیہ کی گئی، ان کو راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے پر ابھارا گیا، ان کو شکست اور فتح، مصیبت اور راحت، بدحالی اور خوش حالی، امن اور خوف، غرض ہر حال میں اس کے مناسب اخلاقیات کی تعلیم دی گئی، اور انھیں اس طرح تیار کیا گیا کہ وہ نبی کے بعد ان کے جانشین بن کر اس دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں۔ دائرۂ ایمان سے باہر جو لوگ تھے، اہل کتاب، منافق، کفار و مشرکین، ان سب کو ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھانے، نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت و نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرانے اور سبق آموز واقعات و احوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی گئی تاکہ ان پر حجت تمام کر دی جائے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا، اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک ۲۳ سال کی مدت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گذرتی رہی ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں

تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی۔ پھر اس دعوت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصے نازل ہوئے وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے جاتے تھے بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے[1]، اس لیے ان کا اسلوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اسلوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، اپنی دعوت و تبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلہ میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے، ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش و عزم پیدا کرنا، دشمنوں کو دوست اور منکروں کو معترف بنانا، مخالفین کی حجت منقطع کرنا اور ان کی اخلاقی طاقت کا استیصال کر دینا، غرض وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک تحریک کے لیڈر کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اللہ نے اپنے پیغمبر پر جو پیغامات القاء کیے ان کا طرز خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسب حال ہوتا ہے۔ اُن میں یونیورسٹی کے لکچر کا سا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ قرآن میں مضامین کی بکثرت تکرار کیوں ہے۔ ایک دعوت اور عملی تحریک کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں، اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے بعد کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے بلکہ اسی مرحلے کی باتوں کا اعادہ کیا جاتا رہے، خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صرف ہو جائیں۔ پھر اگر ایک ہی قسم کی باتوں کا اعادہ ایک ہی عبارت اور ایک ہی ڈھنگ پر کیا جائے تو کان انھیں سنتے سنتے تھک جائیں اور طبیعتیں اُکتانے لگیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مرحلے میں جو باتیں بار بار کہنی ہوں انھیں ہر بار نئے الفاظ، نئے اسلوب، اور نئی آن بان سے کہا جائے تاکہ نہایت خوشگوار طریقہ سے وہ دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اس طریقہ سے مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی اساس جن چیزوں پر ہو انھیں پہلے قدم سے آخری منزل تک کسی وقت اور کسی حال میں نظر ان

[1] اگرچہ قلمبند اسی وقت کر لیے جاتے تھے مگر اشاعت زیادہ تر تحریری نہیں بلکہ زبانی ہوتی تھی۔

سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان کا اعادہ بہرحال دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ اسلامی کے ایک مرحلے میں قرآن کی جتنی سورتیں نازل ہوئی ہیں ان سب میں بالعموم ایک ہی قسم کے مضامین الفاظ اور اندازِ بیان بدل بدل کر آئے ہیں۔ مگر توحید اور صفاتِ الٰہی، آخرت اور حساب و مکافات، رسالت اور ایمان بالکتاب، تقویٰ اور صبر و توکل اور اسی قسم کے دوسرے بنیادی مضامین کی تکرار پورے قرآن میں نظر آتی ہے کیونکہ اس تحریک کے کسی مرحلے میں بھی ان سے ذہول گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بنیادی تصورات اگر کہیں ذرا بھی کمزور ہو جاتے تو تحریک اپنی صحیح روح کے ساتھ نہ چل سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو اسی بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو اُسی ترتیب کے ساتھ کیوں نہ مرتب کر دیا جس ترتیب سے وہ نازل ہوا تھا۔ اوپر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کا نزول اُس ترتیب سے ہوا تھا جس ترتیب سے دعوت کا آغاز اور اس کا ارتقاء ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ دعوت کے تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد وہ ترتیب کسی طرح درست نہ ہو سکتی تھی جو صرف ارتقاءِ دعوت ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ ان پیغامات کو مستقل کتاب کی صورت میں مرتب کرنے کے لیے ایک دوسری ترتیب درکار تھی جو تکمیلِ دعوت کے بعد کی صورتِ حال کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ ابتدا میں اس دعوت کے مخاطبِ اول وہ لوگ تھے جو اسلام سے ناآشنائے محض تھے اور وہاں بالکل ابتدا سے کام کرنا تھا مگر تکمیلِ دعوت کے بعد اس کے مخاطبِ اول وہ لوگ ہو گئے جو اس پر ایمان لا کر ایک امت بن چکے تھے اور اُس کام کو جاری رکھنے کے ذمہ دار قرار پائے تھے جسے پیغمبر نے تمام نظری اور عملی حیثیات سے مکمل کر کے اُن کے سپرد کیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ پہلے وہ خود اپنے فرائض سے، اپنے قوانینِ حیات سے، اور اُن فتنوں سے جو پیغمبروں کی امتوں میں رونما ہوتے رہے ہیں، اچھی طرح واقف اور خبردار ہو جائیں، پھر اسلام سے بیگانہ دنیا کے سامنے خدا کی ہدایت اور اس کے راستہ کی طرف دعوت کو لے کر آگے بڑھیں۔ یہی حکمت قرآن کی موجودہ ترتیب میں ملحوظ ہے جو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایجاد نہیں بلکہ اُسی خدا کے حکم سے دی گئی ہے جس نے قرآن نازل کیا ہے۔

تفہیم القرآن

(۲)

البقرہ

(از رکوع ۵ تا رکوع ۱۴)

اے بنی اسرائیل[1]! میری اُس نعمت کا خیال کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ

---

[1] اسرائیل حضرت یعقوب کا نام تھا جو حضرت اسحاق کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے پوتے تھے۔ اس نام کا لفظی ترجمہ "عبداللہ" یا "بندۂ خدا" یا "الیشور داس" ہے۔ بنی اسرائیل اُنھی کی نسل سے ہیں۔ پچھلے چار رکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اِس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکینِ عرب کی طرف بھی کلام کا رُخ پھر گیا ہے اور موقع موقع سے اُن لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ اس تقریر کو پڑھتے ہوئے حسبِ ذیل باتوں کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

اولاً، اس کا منشا یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کی امّت میں جو تھوڑے بہت لوگ ابھی ایسے باقی ہیں جن میں خیر و صلاح کا عنصر موجود ہے انھیں اُس صداقت پر ایمان لانے اور اس کام میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے جس کو لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اٹھائے گئے تھے۔ اس لیے ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن اور یہ نبی وہی پیغام اور وہی کام لے کر آیا ہے جو اس سے پہلے تمہارے انبیاء اور تمہارے پاس آنے والے صحیفے لائے تھے۔ پہلے یہ چیز تم کو دی گئی تھی تاکہ تم آپ بھی اس پر چلو اور دنیا کو بھی اس کی طرف بلانے اور اس پر چلانے کی کوشش کرو۔ مگر تم دنیا کی رہنمائی تو درکنار، خود بھی اس ہدایت پر قائم نہ رہے اور بگڑتے چلے گئے۔ تمہاری تاریخ اور تمہاری قوم کی موجودہ اخلاقی (باقی صفحہ ۸۸ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۷) دینی حالت خود تمہارے نگاہ پر گواہ ہے۔ اب اللہ نے وہی چیز دے کر اپنے ایک بندے کو بھیجا ہے اور وہی خدمت اس کے سپرد کی ہے۔ یہ کوئی بیگانہ اور اجنبی چیز نہیں ہے، تمہاری اپنی چیز ہے، لہٰذا جانتے بوجھتے حق کی مخالفت نہ کرو بلکہ اسے قبول کر لو اور جو کام تمہارے کرنے کا تھا، مگر تم نے نہ کیا، اسے کرنے کے لیے جو دوسرے لوگ اٹھے ہیں ان کا ساتھ دو۔

ثانیاً، اس کا منشا عام یہودیوں پر حجت تمام کرنا اور صاف صاف ان کی دینی و اخلاقی حالت کو کھول کر رکھ دینا ہے۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمہارے انبیاء لے کر آئے تھے؛ اصول دین میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں جس میں قرآن کی تعلیم توراۃ کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جا رہا ہے کہ جو ہدایت تمہیں دی گئی تھی اُس کی پیروی کرنے میں اور جو رہنمائی کا منصب تمہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا کرنے میں تم بُری طرح ناکام ہوئے ہو، اس کے ثبوت میں ایسے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے جن کی تردید وہ نہ کر سکتے تھے۔ پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکاریوں سے کام لے رہے تھے، اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے، ان سب کی پردہ دری کی جا رہی ہے جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے نیچے دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں ہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل پھول سکے۔ اس طرح اتمام حجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عنصر تھا اس کی آنکھیں کھل گئیں، دوسری طرف عامۃ الناس پر ان لوگوں کا جو مذہبی و اخلاقی اثر تھا وہ ختم ہو گیا، اور تیسری طرف خود اپنے آپ کو بے نقاب دیکھ کر ان کی ہمتیں اتنی پست ہو گئیں کہ وہ اس جرأت کے ساتھ کبھی مقابلہ میں کھڑے نہ ہو سکے جس جرأت کے ساتھ ایک وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے اپنے حق پر ہونے کا یقین ہو۔

ثالثاً، پچھلے چار رکوعوں میں نوع انسانی کو دعوتِ عام دیتے ہوئے جو کچھ کہا گیا تھا اسی کے سلسلہ میں ایک خاص قوم کی متعین مثال لے کر بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑتی ہے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس توضیح کے لیے تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف یہی ایک قوم ہے جو مسلسل چار ہزار برس سے تمام اقوام عالم کے سامنے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی ہوئی ہے۔ ہدایت الٰہی پر چلنے اور نہ چلنے سے جتنے نشیب و فراز کسی قوم کی زندگی میں رونما ہو سکتے ہیں وہ سب اُس (باقی صفحہ ۹۰ پر)

تمھارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا اُسے میں پورا کروں۔ اور وہ میں ہوں جس سے تم ڈرو۔ میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ، یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمھارے پاس پہلے سے موجود تھی پھر سب سے پہلے تم ہی اس کا انکار کرنے والے نہ بن جاؤ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو[۵] اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو[۶]، اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۸) کی عبرتناک سرگذشت میں نظر آجاتے ہیں۔

رابعاً۔ اس سے پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سبق دینا مقصود ہے کہ وہ اُس انحطاط کے گڑھے میں گرنے سے بچیں جس میں پچھلے انبیاء کے پیرو گر گئے۔ یہودیوں کی اخلاقی کمزوریوں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں تاکہ مسلمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ کر چلیں۔ اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ پر تنقید کرتے ہوئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اس کو پڑھتے وقت مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد رکھنی چاہیے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخر کار پچھلی امتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کے بِل میں گھسے ہیں تو تم بھی اسی میں گھسو گے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ، کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا اور کون!۔ نبی اکرم کا یہ ارشاد محض ایک توبیخ نہ تھا بلکہ اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے آپ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کی امتوں میں بگاڑ کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵] تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رد کر رہے تھے۔

[۶] نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں دین اسلام کے اہم ترین ارکان رہے ہیں۔ تمام انبیاء کی طرح انبیاء بنی اسرائیل نے بھی ان کی تاکید کی ہے، مگر یہودی ان سے غافل ہو چکے تھے۔ نماز میں تساہل کرنے لگے تھے اور زکوٰۃ دینے کے بجائے سود کھانے لگے تھے۔

تم بھی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو! کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ صبر اور نماز سے مدد لو،[۶۰] بے شک نماز گراں ہے مگر ان فرماں بردار بندوں پر گراں نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ع ۵

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمھیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی۔[۶۱] اور ڈرو اُس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا، نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا، اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔[۶۲]

---

۶۰ یعنی اگر تمھیں نیکی کے راستہ پر چلنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو اس دشواری کا علاج صبر اور نماز ہے، ان دو چیزوں سے تمھیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی۔

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلہ میں اپنے قلب و ضمیر کے پسند کیے ہوئے راستہ پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔

۶۱ یہ اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم حق تھا اور جسے اقوام عالم کا امام و رہنما بنا دیا گیا تھا تاکہ وہ بندگی رب کے راستہ پر سب قوموں کو بلائیں اور چلائیں۔

۶۲ بنی اسرائیل کے بگاڑ کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آ گئی تھی۔ وہ اس قسم کے خیالات خام میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں، بڑے بڑے اولیاء، صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں، ہماری بخشش تو انھی بزرگوں کے صدقہ میں ہو جائے گی، ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا پا سکتا ہے! انھی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے غافل اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے نعمت یاد دلانے کے ساتھ فوراً ہی ان کی ان غلط فہمیوں کو دور کیا گیا۔

یاد کرو[۶۱] وہ وقت جب ہم نے تم کو فرعونیوں[۶۲] کی غلامی سے نجات بخشی ۔ انھوں نے تمھیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمھارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس حالت میں تمھارے رب کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش[۶۳] تھی۔

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا، پھر اس میں سے تمھیں بخیریت گذروا دیا، پھر وہیں تمھاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔

یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر بلایا[۶۴] تو اس کے پیچھے تم بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے[۶۵]۔ اس وقت تم ظالم تھے، مگر اس پر بھی ہم نے تمھیں معاف کر دیا کہ شاید اب تم شکر گذار بنو۔

---

[۶۱] یہاں سے بعد کے کئی رکوعوں تک مسلسل جن واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور ترین واقعات ہیں جنھیں اس قوم کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ اسی لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔

[۶۲] "آلِ فرعون" کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندانِ فراعنہ اور مصر کا حکمران طبقہ دونوں شامل ہیں۔

[۶۳] آزمائش اس امر کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ نیز آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقہ پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گذار بندے بنتے ہو یا کافرِ نعمت ہو جاتے ہو۔

[۶۴] مصر سے نجات پانے کے بعد جب یہ قوم سینا کے جزیرہ نما میں پہنچ گئی تو حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے چالیس شب روز کے لیے کوہِ طور پر طلب فرمایا تاکہ وہاں اس قوم کے لیے جو اب آزاد ہو چکی تھی قوانینِ شریعت اور عملی زندگی کی ہدایات عطا ہوں۔

[۶۵] گائے یا بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسف کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہوئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انھوں نے من جملہ اور امراض کے ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا۔

یاد کرو کہ ٹھیک اس وقت جب تم یہ ظلم کر رہے تھے، ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان[1] عطا کی تاکہ تم اس کے ذریعہ سے سیدھا راستہ پا سکو۔

یاد کرو جب موسیٰ (یہ نعمت لیے ہوئے پلٹا) تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ "اے قوم! تو نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے اوپر سخت ظلم کیا ہے، لہٰذا تم لوگ اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاک کرو[2]، اسی میں تمھارے خالق کے نزدیک تمھاری بہتری ہے"۔ اُس وقت تمھارے خالق نے تمھاری توبہ قبول کرلی کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمھارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے جب تک کہ اپنی آنکھوں سے علانیہ خدا کو (تم سے کلام کرتے) نہ دیکھ لیں[3]۔ اس وقت تمھارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست صاعقہ نے تم کو آلیا۔ تم بے جان ہو کر گر چکے تھے، مگر پھر ہم نے تم کو جِلا اُٹھایا، شاید کہ اس احسان کے بعد تم شکر گذار بن جاؤ۔

---

[1] فرقان = وہ چیز جس کے ذریعہ سے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اردو میں اس کے مفہوم سے قریب تر لفظ "کسوٹی" ہے۔

[2] توراۃ کی روایت سے اس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ قوم کے جن افراد نے گوسالہ پرستی کی تھی اور اسکی ترویج میں حصہ لیا تھا ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ قرآن کے الفاظ اس مفہوم کے محتمل ہیں مگر بعد کی آیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سزا کے بغیر اللہ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔

[3] یہ جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی جس قرارداد پر حضرت موسیٰ طور کی طرف تشریف لے گئے تھے اس موقع پر آپ کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستر نمائندے بھی لے کر آئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان عطا کی تو آپ نے اسے انہی نمائندوں کے سامنے پیش کیا۔ اس پر ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمھارے بیان پر کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہم کلام ہوا ہے۔ جب تک کہ ہم خود آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ہمیں یقین نہیں آسکتا۔

پھر صحرائے سینا میں ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا[1] من و سلویٰ کی غذا تمھارے لیے فراہم کی[2] اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں کھاؤ، مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ انھوں نے آپ اپنے ہی اوپر ظلم کیا۔

پھر جب ہم نے کہا کہ "یہ بستی[3] جو تمھارے سامنے ہے اس میں داخل ہو جاؤ، اس کی پیداوار جس طرح چاہو مزے سے کھاؤ، مگر بستی کے دروازے میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو اور کہتے جاؤ حِطَّۃٌ حِطَّۃٌ، ہم تمھاری خطاؤں سے درگذر کریں[4] گے اور نیکوکاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے"، تو جو بات کہی گئی تھی ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا۔ آخر کار ہم نے ظلم کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا،

---

[1] یعنی اس لق و دق بیابان میں جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمھیں میسر نہ تھی، ہم نے ابر سے تمھارے بچاؤ کا انتظام کیا۔

[2] مَنّ اور سلویٰ وہ قدرتی غذائیں تھیں جو اس بے آب و گیاہ بیابان میں ان لوگوں کو مل رہی تھیں۔ خدا کے فضل سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم محض انہی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی۔ یہ چیزیں اب بھی اس علاقہ میں بکثرت پائی جاتی ہیں اور اسی نام سے موسوم ہیں (بائیبل کی کتاب خروج۔ باب ۱۶ میں اس کی تفصیل درج ہے)

[3] صحرائے سینا سے گذر کر بنی اسرائیل مواب کے میدانی علاقہ میں پہنچے جو بحیرۂ مردار کے مشرق میں واقع ہے اور وہاں سے اپنے آبائی ملک کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس موقع پر ان کے سامنے ایک طرف شِطّیم وغیرہ شرق اردن کی بستیاں تھیں اور دوسری طرف دریائے اردن کے مغرب میں اریحا (یا یریحو) تھا۔ غالباً انہی میں سے کسی کو فتح کرنے کا حکم ہوا ہوگا جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

[4] "سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو" یعنی حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسو بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہو، جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اور حطۃ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جاؤ۔ دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتل عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگذر اور عام معافی کا اعلان کرتے جاؤ۔ تم دوسروں کو معاف کرو گے تو خدا تمھیں معاف کرے گا۔

اور یہ سزا تھی ان نافرمانیوں کی جو وہ کرتے رہے تھے۔ ع ۶

یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو،
چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے[۷۵] اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کونسی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔
اس وقت یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔
یاد کرو، جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، اپنے
رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار، ساگ ترکاری، گیہوں، لہسن، پیاز، دال وغیرہ نکال دے"
تو موسیٰ نے کہا "کیا ایک بہتر چیز کے بجائے تم ادنیٰ درجہ کی چیزیں لینا چاہتے ہو[۷۶]؟ اچھا، کسی شہری آبادی
میں جا رہو، جو کچھ تم مانگتے ہو وہاں مل جائے گا۔" آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور
پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے
کفر کرنے لگے[۷۷] اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے[۷۸]۔ یہ نتیجہ تھا اُن کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حدود
شرع سے نکل نکل جاتے تھے۔ ع ۷

---

۷۵ وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاحوں نے اسے دیکھا ہے اور اس میں شگاف بھی پائے جاتے ہیں۔

۷۶ یہ مطلب نہیں ہے کہ من و سلویٰ چھوڑ کر، جو بے مشقت مل رہا ہے، وہ چیزیں مانگ رہے ہو جن کے لئے کھیتی باڑی کرنی پڑے گی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرا نوردی تم سے کرائی جا رہی ہے اس کے مقابلہ میں کیا تم کو کام و دہن کی لذت اتنی زیادہ مرغوب ہے کہ اُس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدت کے لیے برداشت نہیں کر سکتے؟

۷۷ آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے مرغوبات یا خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ خدا نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکم الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ (باقی صفحہ ۹۵)

یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے ہوں یا یہودی، عیسائی یا صابی، جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اُس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا اندیشہ نہیں۔[۸۰]

(بقیہ صفحہ ۹۴) ارشادِ الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق بدل ڈالا۔

[۷۹] مثلاً حضرت یسعیاہ، یرمیاہ، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام کو قتل کیا، حضرت عیسیٰ کے قتل کا اقدام کیا، بلکہ یہ لوگ اپنی طرف سے تو ان کو سولی پر چڑھا ہی چکے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے انھیں اپنی قدرت سے بچا لیا۔ یہودی علما اور عوام جن قوانین کے خود قائل تھے اُن کی رو سے بھی اِن انبیاء نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا جس کی بنا پر وہ قتل کے مستحق ہوتے۔ ان کا قصور اگر تھا تو یہ تھا کہ انھیں گناہوں پر ٹوکتے تھے، ریاکاریوں پر ملامت کرتے تھے، ایمان داری اور راستبازی کی تائید کرتے تھے۔ اس پر یہ لوگ ان کے دشمن بن گئے اور جھوٹے الزام رکھ رکھ کر انھیں قتل کی سزائیں دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو جھوٹا مقدمہ بنایا گیا وہ اس قوم کے دامن پر ایک مستقل داغ ہے اور اس سے زیادہ بدنما داغ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ جیسے ایک مردِ صالح کا سر محض ایک رقاصہ کی فرمائش پر قلم کر دیا گیا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۸۰] جس سلسلۂ عبارت میں یہ آیت آئی ہے اس کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے کہ کن کن باتوں کو آدمی مانے اور کیا اعمال کرے تو خدا کے ہاں اجر کا مستحق ہو۔ یہ چیزیں اپنے اپنے موقع پر تفصیل کے ساتھ آئیں گی۔ یہاں تو یہودیوں کے اس زعمِ باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے اور اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ اُن کے گروہ سے اللہ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے، لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے وہ خواہ اعمال اور عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو، بہر حال نجات اس کے لیے مقدر ہے، اور باقی تمام انسان جو ان کے گروہ سے باہر ہیں وہ صرف جہنم کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بتایا گیا کہ اللہ کے ہاں اصل چیز تمھاری یہ گروہ بندیاں نہیں ہیں بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ ایمان اور عمل صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر حاضر ہو گا وہ اپنے رب سے اپنا اجر پائے گا۔

عمل صالح کے متعلق یہ بات اور ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اعمال کی ظاہری صورتوں کا نام (باقی صفحہ ۹۶ پر)

یاد کرو وہ وقت جب ہم نے طور کو تم پر اُٹھا کر تم سے[1] پختہ وعدہ لیا تھا اور کہا تھا کہ "جو کتاب ہم تمھیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا اور جو احکام و ہدایات اس میں درج ہیں انھیں یاد رکھنا۔ اسی ذریعہ سے توقع کی جاسکتی ہے کہ تم تقویٰ کی روش پر چل سکوگے"۔ مگر اس کے بعد تم اپنے عہد سے پھر گئے اس پر بھی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت نے تمھارا ساتھ نہ چھوڑا۔ ورنہ تم کبھی کے تباہ ہو چکے ہوتے۔

پھر تمھیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ معلوم ہے جنھوں نے سبت[2] کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انھیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) عمل صالح نہیں ہے، مثلاً نفس یہ فعل کہ تم نے غریب کو کھانا کھلایا، یا کسی بیمار کی مدد کی، نیک عمل نہ کہلائے گا، بلکہ اس لفظ کا اطلاق صرف ان اعمال پر ہوگا جو اللہ کو اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرنے کے بعد، اپنے آپ کو اس کے سامنے ذمہ دار سمجھتے ہوئے، اس کی کتاب اور اس کے نبی کی رہنمائی کے مطابق کیے جائیں۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا بلکہ خود مختارانہ طریقہ پر آپ جن اعمال کو نیک سمجھتا ہے ان پر عمل کرتا ہے، یا خدا کی رضا کے لیے نہیں بلکہ اپنے ضمیر کی تسکین کے لیے کرتا ہے، یا اعمال کے نیک و بد ہونے کا معیار و ضابطہ خدا کے مقرر کیے ہوئے قانون کے بجائے کہیں اور سے لیتا ہے وہ صالح نہیں، باغی ہے۔ خدا کے اُس بندے کو خدا کی سلطنت میں رہتے ہوئے یہ رویہ اختیار کرنے کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں ہے۔ پھر اس کی ظاہری نیکی حقیقی نیکی کس طرح ہو سکتی ہے؟ نیکی تو حقیقت میں پابندی قانون کا نام ہے اور خدا کی اس سلطنت میں قانون صرف خدا ہی کا مسلّم ہے۔ اس قانون کی اطاعت سے منہ موڑ کر جو عمل بھی کوئی کرتا ہے وہ سلطان کائنات کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو لوگ انسانیت کی عمدہ صفات کا اظہار کرتے ہیں ان میں اور اُن لوگوں میں جو رذیل اور مفسدانہ و شریرانہ صفات کا اظہار کرتے ہیں، خدا کے نزدیک فرق ہے

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اس واقعہ کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ مشہور و معروف واقعہ تھا۔ لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آپڑے گا۔ ایسا ہی کچھ نقشہ سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں کھینچا گیا ہے۔

[2] سبت = ہفتہ کا دن، شنبہ۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کا دن عبادت کے لیے مخصوص رکھیں اور اس میں کوئی دوسرا کام نہ کریں۔

کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے[۱]۔ اس طرح ہم نے ان کے انجام کو اس زمانہ کے لوگوں اور بعد کی آنے والی نسلوں کے لیے عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت بنا کر چھوڑا۔

پھر وہ واقعہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کہنے لگے کیا تم ہم سے تمسخر کرتے ہو؟ موسیٰ نے کہا میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں۔ بولے اچھا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ ہمیں اس گائے کی کچھ تفصیل بتائے۔ موسیٰ نے کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، بلکہ اوسط عمر کی ہو، لہذا جو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرو۔ پھر کہنے لگے اپنے رب سے یہ اور پوچھ دو کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے زرد رنگ کی گائے ہونی چاہیے جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔ پھر بولے اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کیسی گائے مطلوب ہے، ہمیں اس کے تعین میں اشتباہ ہو گیا ہے، اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے۔ موسیٰ نے جواب دیا، اللہ کہتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی، نہ زمین جوتتی ہے نہ پانی کھینچتی ہے، صحیح سالم اور بے داغ ہے۔ اس پر وہ پکار اُٹھے کہ ہاں اب تم نے ٹھیک پتہ بتایا ہے۔ پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے[۲]۔ ع ۸

---

[۱] اس واقعہ کی تفصیل سورۂ اعراف رکوع ۲۱ میں بیان ہوئی ہے۔ ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی۔ اور بعض اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور انداز بیان سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں جسمانی تھا۔ اور میرے نزدیک زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔

[۲] چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض (باقی صفحہ ۹۸ پر)

اور تمھیں یاد ہے وہ واقعہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام تھوپنے لگے تھے، اور اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے کھول کر رکھ دے گا۔ اس وقت ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ، دیکھو اس طرح اللہ مردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو[لہ]۔ مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمھارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی بڑھے ہوئے، کیونکہ پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے، اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے ــــ خیر، تم اس خیال میں نہ رہو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے غافل ہے۔

(بقیہ صفحہ ۹۷) کی چھوت لگ گئی تھی اس لیے ان پر فرض کیا گیا کہ گائے ذبح کریں۔ ان کے ایمان کا امتحان ہی اس طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی اب خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے، تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس بُت کو معبود سمجھتے رہے ہیں اُسے اپنے ہاتھ سے توڑیں۔ یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پوری طرح ایمان اترا ہوا نہ تھا اس لیے انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخر کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر جسے اس زمانہ میں پرستش کے لیے مختص کیا جاتا تھا، گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [لہ] اس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی "لاش کو اس کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ" اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انھیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک کاری ضرب لگی کہ اُس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی، کجا کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا اس طرح مفید ثابت ہو۔

اب کیا اِن لوگوں سے تم یہ توقع رکھتے ہو[1] کہ یہ تمھاری دعوت پر ایمان لے آئیں گے ؟ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کی[2]۔ محمد رسول اللہ کے ماننے والوں سے ملے تو کہہ دیا کہ ہم بھی انھیں مانتے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے تخلیہ کی بات چیت ہوئی تو کہا کہ بے وقوف ہو گئے ہو ؟ اِن لوگوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ تمھارے رب کے پاس تمھارے مقابلہ میں انھیں حجت میں پیش کریں[3]؟ ——— اور کیا یہ جانتے

ف۱ خطاب اُن نومسلموں سے ہے جو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی سابق روایات یہ کچھ رہی ہیں ان سے تم کچھ بہت زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمھاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ بات ارشاد فرمانے کی خاص طور پر ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اُس زمانہ میں یہودیوں نے اپنی ظاہری مذہبیت اور اپنے علمِ کتاب کا اچھا خاصا سکّہ اہلِ عرب پر بٹھا رکھا تھا، خصوصیت کے ساتھ اہلِ مدینہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے ان یہودیوں سے بہت مرعوب تھے۔ پھر جب مدینہ والوں نے اسلام قبول کیا تو قدرتی طور پر ان کو یہ توقع تھی کہ جو لوگ پہلے ہی سے انبیاء اور کتبِ الٰہی کے پیرو ہیں وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ اِس راہ میں پیش پیش نظر آئیں گے۔ لہٰذا ان کو یہ بتا دینا ضروری تھا کہ یہ لوگ صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں، اللہ کی جن آیات کو سن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، انھی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں، دینِ حق کو مسخ کر کے یہ اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال چکے ہیں اور اسی مسخ شدہ دین سے یہ نجات کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، ان سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ حق کی آواز بلند ہوتے ہی یہ ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں گے۔

ف۲ "ایک گروہ" سے مراد ان کے علماء اور حاملینِ شریعت ہیں۔ "کلام اللہ" سے مراد توراۃ، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو ان کے انبیاء کے ذریعہ سے پہنچیں۔ "تحریف" کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اس کے اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا جو قائل کے منشاء کے خلاف ہوں۔

ف۳ ان کا مطلب یہ تھا کہ توراۃ اور دیگر کتبِ آسمانی میں جو پیشینگوئیاں اس نبی کے متعلق موجود ہیں، یا جو آیات اور تعلیمات ان کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے تمھاری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے، انھیں مسلمانوں کے سامنے

(باقی صفحہ ۱۰۰ پر)

نہیں ہیں کہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے ؟ — ان میں ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو کچھ علم رکھتے نہیں، بس اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں[۱]۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے[۲] ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضہ میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کریں، ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔ وہ کہتے ہیں[۳] کہ دوزخ کی آگ ہمیں ہرگز چھونے والی نہیں اِلاّیہ کہ چند روز کی سزا مل جائے تو مل جائے۔ ان سے پوچھو، کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے جس کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹) بیان نہ کرو ورنہ یہ تمہارے رب کے سامنے ان کو تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فساد عقیدہ کا حال تھا۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لے گئے تو آخرت میں ان پر مقدمہ نہ چل سکے گا۔ اسی لیے بعد کے جملۂ معترضہ میں ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا تم اللہ کو بے خبر سمجھتے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ یہ ان کے عوام کا حال تھا کہ علم کتاب سے کورے تھے، کچھ نہ جانتے تھے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اصول بتائے ہیں، اخلاق اور شرع کے کیا قواعد سکھائے ہیں، اور انسان کی فلاح و خسران کا مدار کن چیزوں پر رکھا ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور اپنی خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی باتوں کو دین سمجھے بیٹھے تھے اور جھوٹی توقعات پر جی رہے تھے۔

۲؎ یہ اُن کے علماء کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے۔ ان لوگوں نے صرف یہی نہ کیا کہ کلام الٰہی کے معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ اپنی تفسیروں کو، اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلام الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الٰہیاتی عقیدہ، اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد جس نے مجموعۂ کتب مقدسہ میں جگہ پالی، اللہ کا کلام بن کر رہ گیا۔ (باقی صفحہ ۱۰۱پر)

خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا؟ یا یہ بات ہے کہ تم اللہ کے ذمہ ڈال کر ایسی باتیں کہہ دیتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے کہ اس نے ان کا ذمہ لیا ہے؟ آخر تمھیں دوزخ کی آگ کیوں نہ چھوے گی؟ جو بھی بدی کمائے گا اور اپنی خطا کاری کے چکر میں پڑا رہے گا وہ دوزخی ہے اور دوزخ ہی میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں وہی جنتی ہیں اور جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ع ۹

یاد کرو! اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا، بالعموم لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ مگر تھوڑے آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور اب بھی پھرے ہوئے ہو۔ پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم و زیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پکڑے ہوئے تمھارے پاس آتے ہیں تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ کا لین دین کرتے ہو حالانکہ انھیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ [۱] پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل

(حواشی صفحہ ۱۰۰) اس پر ایمان لانا فرض ہوگیا اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھر جانے کے ہوگئے۔

[۵] یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے کہ وہ سمجھتے ہیں، ہم خواہ کچھ کریں بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینہ کے اطراف میں جو یہودی قبائل آباد تھے (باقی صفحہ ۱۰۲)

ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔ اللہ ان حرکات سے بے خبر
نہیں ہے جو تم کر رہے ہو ـــــ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے، لہٰذا
آخرت میں ان کے لیے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی اور نہ وہاں انھیں کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ ع ۱۰

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے، پھر عیسیٰ ابن مریم کو روشن
نشانیاں دے کر بھیجا اور روحِ پاک[^1] سے اس کی مدد کی۔ مگر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول
تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی ہی
کی، پھر کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا؟ ـــ وہ کہتے ہیں، ہمارے دل محفوظ ہیں[^2]۔ نہیں، اصل بات یہ
ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی پھٹکار پڑی ہے اس لیے وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں ـــ اور
اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ
اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱) انھوں نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ایک عرب قبیلہ کی دوسرے قبیلہ سے جنگ ہوتی تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوتے تھے۔ یہ فعل صریح طور پر کتاب اللہ کے خلاف تھا اور وہ جانتے بوجھتے کتاب کی یہ خلاف ورزی کر رہے تھے۔ مگر لڑائی کے بعد جب ایک یہودی قبیلہ کے اسیران جنگ دوسرے یہودی قبیلہ کے ہاتھ آتے تھے تو غالب قبیلہ فدیہ لے کر انھیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر انھیں چھڑاتا تھا، اور اس فدیہ کے لین دین کو جائز ٹھیرانے کے لیے کتاب اللہ سے استدلال کیا جاتا تھا۔ گویا کتاب اللہ کی اس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیران جنگ کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے مگر اس حکم کو ٹھکرا دیتے تھے کہ آپس میں جنگ ہی نہ کی جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [^1]: "روح پاک" سے مراد علم وحی بھی ہے، اور جبریل بھی جو وحی کا علم لاتے تھے، اور خود حضرت مسیح کی اپنی پاکیزہ روح بھی جس کو اللہ نے قدسی صفات بنایا تھا۔ اور "روشن نشانیوں" سے مراد وہ کھلی کھلی علامات ہیں جنھیں دیکھ کر ہر صداقت پسند طالب حق انسان یہ معلوم کر سکتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں۔

[^2]: یعنی ہم اپنے عقیدہ و خیال میں اتنے پختہ ہیں کہ تم خواہ کچھ کہو ہمارے دلوں پر تمہاری بات کا اثر نہ ہوگا۔

کفار کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے[۹۵]، مگر جب وہ چیز آگئی، جسے وہ پہچان بھی گئے، تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت اِن نہ ماننے والوں پر، کیسا برا ذریعہ ہے جس سے یہ اپنے نفس کی تسلی حاصل کرتے ہیں[۹۶] کہ جو ہدایت اللہ نے نازل کی ہے اس کو قبول کرنے سے صرف اس بنا پر انکار کر رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل (وحی و رسالت) سے اپنے جس بندے کو خود چاہا نواز دیا[۹۷]! لہٰذا اب یہ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے ہیں، اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلت آمیز سزا مقرر ہے۔

جب اُن سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اُسے مانو تو انھوں نے کہا کہ ہم صرف وہ چیز قبول کرتے ہیں جو ہمارے ہاں (یعنی نسل اسرائیل میں) اُتری ہے۔ اس دائرے کے باہر جو کچھ آیا ہے اسے ماننے سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اس تعلیم کی تصدیق و تائید کر رہا ہے جو ان کے ہاں پہلے سے موجود ہے۔ اچھا ان سے کہو، اگر تم اُس تعلیم پر ایمان رکھنے والے ہو جو تمھارے ہاں آئی تھی تو اس سے پہلے اللہ کے پیغمبروں کو (جو خود بنی اسرائیل ہی میں پیدا ہوئے تھے) کیوں قتل کرتے رہے؟ تمھارے پاس موسیٰ کیسی کیسی روشن نشانیوں کے ساتھ آئے پھر بھی تم ایسے ظالم تھے کہ ان کے پیٹھ موڑتے ہی بچھڑے کو معبود بنا

---

[۹۵] یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے جب یہودی انتہائی پستی و خستہ حالی میں مبتلا تھے اور دنیا میں ہر جگہ مارے کھدیڑے جا رہے تھے، اُس وقت وہ اپنی گھڑیاں اُس نبی کے انتظار میں کاٹا کرتے تھے جس کی بعثت کی پیشینگوئیاں ان کے انبیا نے کی تھیں، اور دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا غلبہ مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہلِ عرب اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے ہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے۔

[۹۶] اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "کیسی بُری چیز ہے جس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا"۔ یعنی اپنی فلاح و سعادت اور اپنی نجات کو قربان کر دیا۔

[۹۷] یہ لوگ چاہتے تھے کہ آنے والا نبی ان کی قوم میں پیدا ہو۔ مگر جب وہ ایک دوسری قوم میں پیدا ہوا جسے وہ اپنے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے تو وہ اس کے انکار پر آمادہ ہو گئے۔ گویا اُن کا مطلب یہ تھا کہ اللہ ان سے پوچھ کر نبی بھیجتا۔ جب اس نے ان سے نہ پوچھا اور اپنے فضل سے خود جسے چاہا نواز دیا تو وہ بگڑ بیٹھے۔

بیٹھے۔ پھر ذرا اس میثاق کو یاد کرو جو طور کو تمھارے اوپر اٹھا کر ہم نے تم سے لیا تھا۔ ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔ تمھارے اسلاف نے کہا کہ ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں، اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا۔ کہو، اگر تم مومن ہو تو یہ عجیب ایمان ہے جو ایسی بری حرکات کا تمھیں حکم دیتا ہے۔

ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمھارے ہی لیے مخصوص ہے تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو [۵] اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے اس لیے کہ اپنے ہاتھوں جو کچھ کما کر انھوں نے وہاں بھیجا ہے اس کا اقتضا یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں)۔ اللہ ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ تم انھیں سب سے بڑھ کر جینے کا حریص پاؤ گے حتیٰ کہ یہ اس معاملہ میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ہزار برس جیے۔ حالانکہ لمبی عمر بہر حال انھیں عذاب سے تو دور نہیں پھینک سکتی۔ جیسے کچھ

ع ۱۱ اعمال یہ کر رہے ہیں اللہ تو انھیں دیکھ ہی رہا ہے۔

ان سے کہو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو [۶] اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل ہی نے اللہ کے اذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتا ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ (اگر اس بنا پر کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہے تو اس سے کہدو کہ) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کے دشمن

---

[۵] یہ ایک تعریض اور نہایت لطیف تعریض ہے ان کی دنیا پرستی پر۔ جن کو واقعی دار آخرت سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے وہ دنیا پر مرے نہیں جاتے اور نہ موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے برعکس تھا اور ہے۔

[۶] یہودی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں ہی کو برا نہ کہتے تھے بلکہ خدا کے برگزیدہ فرشتے جبریل کو بھی گالیاں دیتے تھے اور کہتے تھے وہ ہمارا دشمن ہے، وہ رحمت کا نہیں عذاب کا فرشتہ ہے۔

ہیں اللہ اُن کافروں کا دشمن ہے۔ ہم نے تمہاری طرف ایسی آیات نازل کی ہیں جو صاف صاف حق کا اظہار کرنے والی ہیں، اور ان کی پیروی سے صرف وہی لوگ انکار کریں گے جو فاسق ہیں۔ کیا ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ جب انھوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک نہ ایک گروہ نے اسے ضرور ہی بالائے طاق رکھ دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہی ہیں جو سچے دل سے ایمان نہیں لاتے۔ اور جب اِن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا جو اِن کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو اِن اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پسِ پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں، اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین، سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے[۱]۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے ـــــ اور پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ "دیکھ، ہم محض ایک آزمائش ہیں، تو کفر میں مبتلا نہ ہو"[۲]۔ پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں[۳]۔ ظاہر تھا کہ اذن

---

[۱] شیاطین سے مراد شیاطینِ جن اور شیاطینِ انس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و مادّی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی و اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو جادو ٹونے اور طلسمات و "عملیات" کی طرف ان کی توجہات مبذول ہونے لگیں اور وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے کہ کسی مشقت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور منتروں سے سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں سب کچھ چند نقوش اور منتروں کا نتیجہ تھیں اور وہ ہم تمھیں بتاتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی حق کی آواز انھوں نے سن کر دی۔

[۲] اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں۔ مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں جب بنی اسرائیل کا اخلاقی زوال انتہا کو پہنچا ہوا تھا اس وقت دو فرشتے انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے (باقی صفحہ ۱۰۶ پر)

الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے
جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں بلکہ نقصان دہ تھی اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس
کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۔۔۔ کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا،
کاش انھیں معلوم ہوتا! اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں اس کا جو بدلہ ملتا وہ ان کے لیے
زیادہ بہتر تھا، کاش انھیں خبر ہوتی! ع ۱۲

(بقیہ حواشی صفحہ ۱۰۵) بھیجے گئے تھے، جس طرح قوم لوط کے پاس خوبصورت لڑکوں کی شکل میں فرشتے آئے تھے۔ ان فرشتوں نے ایک ایسی چیز پیش کی جس کے طالب وہی لوگ ہو سکتے تھے جو بداخلاقی کی حد کو پہنچ چکے ہوں۔ پھر اتمام حجت کے لیے وہ ہر ایک کو متنبہ بھی کر دیتے تھے کہ دیکھو ہم تمھارے لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود وہ لوگ اسی چیز کے طالب ہوئے اور اس طرح ان کا جرم پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔۔۔ فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الٰہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلہ میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

۵۳ یہ اس اخلاقی زوال کا انتہائی درجہ تھا جس میں یہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کی آخری حد یہ ہے کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منکوحہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔ اس لیے کہ ازدواجی تعلق انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی، اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ پس بدترین مفسد وہ ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ لگائے جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ شیطانِ اعظم، ابلیس زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایجنٹ بھیجتا ہے، پھر وہ ایجنٹ واپس آکر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ برپا کیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شر کھڑا کیا، مگر ابلیس ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں تفرقہ ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔۔۔ (باقی صفحہ ۱۰۷ پر)

اے ایمان لانے والو![۱۰۵] رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہو اور توجہ سے بات کو سنو۔[۱۰۶] یہ کافر تو عذابِ الیم کے مستحق ہیں۔ یہ لوگ جنھوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، خواہ اہلِ کتاب میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶) یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انھیں عورت اور مرد کے درمیان جدائی ڈالنے کا "عمل" ان کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جا سکتا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۰۵] اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرنے والوں کو اُن شرارتوں سے خبردار کیا گیا ہے جو یہودیوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں، ان شبہات کے جوابات دیے گئے ہیں جو یہ لوگ مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور ان خاص خاص نکات پر کلام کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ یہودیوں کی گفتگو میں زیرِ بحث آیا کرتے تھے۔ اس موقع پر یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی تو یہودی جگہ جگہ مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنی موشگافیوں اور تشکیکات اور سوال میں سے سوال نکالنے کی بیماری ان سیدھے اور سچے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے، اور خود نبی اکرم کی مجلس میں آکر پُرفریب مکارانہ باتیں کر کے اپنی گھٹیا درجہ کی ذہنیت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

[۱۰۶] یہودی جب آنحضرت کی مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقہ سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذو معنی الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیرِ لب کچھ اور کہہ دیتے، اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، یہ ایک ذو معنی لفظ تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں انھیں کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ایک ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے، یا ہماری بات سن لیجیے، مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنی تھے "سُن، تو بہرا ہو جائے"۔ اور خود عربی میں اس کے ایک معنی صاحبِ رعونت اور جاہل و احمق کے بھی تھے، (باقی صفحہ ۱۰۸ پر)

ہوں یا مشرک ہوں، ہرگز یہ پسند نہیں کرتے کہ تمھارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بھلائی نازل ہو، مگر اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے چن لیتا ہے اور وہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کردیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی[ل] کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؟ کیا تمھیں خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی فرمانروائی اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے سوا کوئی تمھاری خبرگیری کرنے اور تمھاری مدد کرنے والا نہیں ہے؟ پھر کیا تم اپنے رسول سے اُس قسم کے سوالات اور مطالبے کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۷) اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو تو ہم تمھاری سنیں، اور ذرا زبان کو لچکا دے کر راعینا بھی بنا دیا جاتا تھا جس کے معنی "اے ہمارے چرواہے" کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے انظرنا کہا کرو یعنی ہماری طرف توجہ فرمائیے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ "توجہ سے بات کو سنو"، یعنی یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں اُلجھے رہتے ہیں، مگر تمھیں غور سے نبی کی باتیں سُننی چاہئیں تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [ل] یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے احکام اور اس کے احکام میں فرق کیوں ہے؟ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر یہ تمھارا قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی اور عیسائی اُس تعلیم کے ایک حصہ کو بھول گئے جو انھیں دی گئی تھی، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی تعلیم اور وہ حافظوں سے محو ہو جائے؟ یہ ساری باتیں وہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں، اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں سے محو کر دوں، مگر جس چیز کو میں منسوخ یا محو کرتا ہوں اس سے بہتر چیز اس کی جگہ پر لاتا ہوں یا کم از کم ویسی ہی۔

کیے جا چکے ہیں؟[۱۰۹] حالانکہ جس شخص نے ایمان کی روش کو کفر کی روش سے بدل لیا وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمھیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ اگرچہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمھارے لیے ان کی یہ خواہش ہے۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو[۱۱۰] یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے اللہ کے ہاں اسے موجود پاؤ گے۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔ یہ سب ان کی اپنی تمنائیں ہیں، ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دراصل نہ تمھاری کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی، حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اُس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔ ع ۱۳

[۱۰۹] یہودی موشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے ذہن میں پیدا کرتے تھے اور انھیں اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کو بار بار متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل وقال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمتیں تباہ ہو چکی ہیں، تم اس سے پرہیز کرو، جن سوالات کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا ان کی کھوج میں نہ لگو، بس جو حکم تمھیں دیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو اور جن امور سے منع کیا جاتا ہے ان سے رک جاؤ۔ دور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو۔

[۱۱۰] یعنی ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہو، اپنا توازن نہ کھو بیٹھو، ان سے بحث و مناظرے کرنے اور جھگڑنے میں اپنا قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو، صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے، فضولیات میں اپنی قوتیں صرف کرنے کے بجائے خدا کے ذکر اور بھلائی کے کاموں میں انھیں صرف کرو کہ یہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ہے نہ کہ وہ۔

یہودی کہتے ہیں عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں، عیسائی کہتے ہیں یہودیوں کے پاس کچھ نہیں۔ حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں۔ اور اسی قسم کے دعوے ان لوگوں کے بھی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم نہیں ہے۔ یہ اختلافات جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں، ان کا فیصلہ اللہ ہی قیامت کے روز کرے گا۔ مگر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو۔ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں[۱]۔ ان کے لیے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم۔

مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، جس طرف بھی تم رُخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رُخ ہے[۲]۔ اللہ بڑی وسعت والا[۳] اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

---

[۱] یعنی بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں ان کے قبضہ و اقتدار میں ہوں اور یہ اُن کے متولی ہوں، ہونا یہ چاہیے کہ خدا پرست اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے متولی رہیں، تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی تو انھیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے۔ یہاں ایک لطیف اشارہ کفارِ مکہ کے اس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے اپنے ان برادرانِ قومی کو جو اسلام لا چکے تھے بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا۔

[۲] یعنی اللہ نہ شرقی ہے نہ غربی، وہ کسی سمت یا کسی مقام میں مقید نہیں ہے، لہٰذا نہ تو اس کی عبادت کے لیے کسی سمت یا مقام کو مقرر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ وہیں اُسی جانب ہے، اور نہ یہ کوئی جھگڑنے اور بحث کرنے کے قابل بات ہے کہ پہلے تم وہاں یا اس طرف عبادت کرتے تھے، اب تم نے اس جگہ یا سمت کو بدل کیوں دیا۔ یہ اشارۃً اس اعتراض کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں پر سمتِ قبلہ بدلنے کے سلسلہ میں کر رہے تھے۔ آگے چل کر اس کا مفصل جواب آنے والا ہے۔

[۳] "اللہ بڑی وسعت والا ہے" یعنی وہ نہ محدود ہے نہ تنگ نظر۔

ان کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے اِن باتوں سے، اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں، سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں، وہ آسمانوں اور زمین کا موجِد ہے، اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے۔

نادان کہتے ہیں کہ اللہ خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی کیوں نہیں دکھاتا؟ ایسی ہی باتیں ان سے پہلے بھی لوگ کہتے تھے۔ اِن سب کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔ یقین لانے والوں کے لیے تو ہم نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں، (اس سے بڑھ کر نشانی کیا ہو گی کہ) ہم نے تم کو علمِ حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اب جو لوگ جہنم سے رشتہ جوڑ چکے ہیں اُن کی طرف سے تم ذمہ دار و جواب دہ نہیں ہو۔

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو۔[۱۱] صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اُسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ وہ اُس پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں۔[۱۲] اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں وہی اصل میں نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ع ۱۴

---

[۱۱] یہ عام اہل کتاب کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ وہ کبھی تم سے خوش نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی ناراضی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ سچے طالب حق ہیں اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے، بلکہ وہ تو اس لیے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں نہ اختیار کیا، خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی، دین کے اصول و احکام کو اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لیا، وہ ریاکاری اور گندم نمائی و جو فروشی کیوں نہ کی جو خود اُن کا شیوہ ہے۔ لہٰذا انھیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو، کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کر لو، دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرنے لگو جو خود یہ کرتے ہیں، اور عقائد و اعمال کی انھی گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا محال ہے۔

[۱۲] یہ اہل کتاب کے صالح عنصر کی طرف اشارہ ہے، کہ یہ لوگ دیانت اور راستی کے ساتھ خدا کی کتاب کو پڑھتے ہیں اس لیے جو کچھ کتاب اللہ کی رو سے حق ہو اُسے حق مان لیتے ہیں۔

مقالات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

(۳)

قوم لوط | قوم ابراہیم کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کی اصلاح پر حضرت ابراہیم کے بھتیجے حضرت لوط مامور کیے گئے تھے۔ اس قوم کے متعلق بھی قرآن سے ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس بات کی منکر تھی کہ اللہ خالق اور رب بمعنی اول و دوم ہے، البتہ اسے انکار اس سے تھا کہ اللہ ہی کو تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی میں بھی رب مانے اور اس کے معتمد علیہ نمائندے کی حیثیت سے رسول کے اقتدار کو تسلیم کرے۔ وہ مخلوق و مربوب ہونے کے باوجود اپنے لیے یہ آزادی باقی رکھنا چاہتی تھی کہ اپنی خواہش کے مطابق خود جس طرح چاہے کام کرے۔ یہی اس کا اصلی جرم تھا اور اسی بنا پر وہ عذاب میں مبتلا ہوئی۔ قرآن کی حسب ذیل تصریحات اس پر شاہد ہیں:

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۔ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ (الشعراء۔ ۹)

جب ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہ کروگے؟ دیکھو میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا اللہ کے غضب سے بچو اور میری اطاعت کرو۔ اس کام پر میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ تو صرف رب العالمین ہی کے ذمہ ہے۔ کیا دنیا کے لوگوں میں سے تم لڑکوں کی طرف جاتے ہو اور تمہارے رب نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں انھیں چھوڑ دیتے ہو؟ تم بڑے ہی حد سے گذرنے والے لوگ ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ خطاب ایسے ہی لوگوں سے ہو سکتا تھا جو اللہ کے وجود اور اس کے خالق اور پروردگار ہونے کے منکر نہ ہوں چنانچہ جواب میں وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اللہ کیا چیز ہے، یا وہ پیدا کرنے والا کون ہوتا ہے، یا وہ کہاں سے ہمارا رب ہو گیا، بلکہ کہتے یہ ہیں کہ

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ (الشعراء - ۹)	اے لوط! اگر تم اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو ملک سے نکال باہر کیے جاؤ گے۔

دوسری جگہ اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا گیا ہے:

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (عنکبوت - ۳)	اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ وہ فعل شنیع کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہ کیا تھا، کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، راستوں پر ڈاکے مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں علانیہ ایک دوسرے کے سامنے بدکاریاں کرتے ہو؟ تو اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لے آ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو۔

کیا یہ جواب کسی منکر خدا قوم کا ہو سکتا تھا؟ پس معلوم ہوا کہ اُن کا اصلی جرم انکارِ الوہیت و ربوبیت نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ اگرچہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کو الٰہ اور رب مانتے تھے لیکن اپنے اخلاق، تمدن اور معاشرت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کے رسول کی ہدایت پر چلنے کے لیے تیار نہ تھے۔

قوم شعیب | اس کے بعد اہل مدین اور اصحاب الایکہ کو لیجیے جن میں حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تھے۔ اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کے وجود اور اس کے الٰہ اور رب ہونے کے قائل تھے یا نہ تھے۔ ان کی حیثیت دراصل ایک ایسی

قوم کی تھی جس کی ابتدا اسلام سے ہوئی اور بعد میں وہ عقائد و اعمال کی خرابیوں میں مبتلا ہو کر بگڑتی چلی گئی۔ بلکہ قرآن سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مومن ہونے کے بھی مدعی تھے، چنانچہ بار بار حضرت شعیب ان سے فرماتے ہیں کہ "اگر تم مومن ہو" تو تمھیں یہ کرنا چاہیے۔ حضرت شعیب کی ساری تقریروں اور ان کے جوابات کو دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جو اللہ کو مانتی تھی، اُسے معبود اور پروردگار بھی تسلیم کرتی تھی، مگر دو طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئی تھی: ایک یہ کہ وہ فوق الفطری معنی میں اللہ کے سوا دوسروں کو بھی الٰہ اور رب سمجھنے لگی تھی اس لیے اس کی عبادت صرف اللہ کے لیے مختص نہ رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک اللہ کی ربوبیت کو انسان کے اخلاق، معاشرت، معیشت اور تمدن و سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا، اس بنا پر وہ کہتی تھی کہ اپنی تمدنی زندگی میں ہم مختار ہیں، اپنے معاملات کو جس طرح چاہیں چلائیں۔

قرآن کی حسب ذیل آیات ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں:

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا، قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ، قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ... وَاِنْ کَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْکُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا وَهُوَ خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ۔

(اعراف - ۱۱)

اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو کہ اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ہے، تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس روشن ہدایت آچکی ہے۔ پھر تم ناپ تول ٹھیک کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح کی جا چکی تھی، اسی میں تمھاری بھلائی ہے اگر تم مومن ہو..... اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس ہدایت پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لاتا ہے اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ. بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ. وَمَآ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ. قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ.	اور اے برادرانِ قوم! پیمانے اور ترازو انصاف کے ساتھ پورے پورے ناپو اور تولو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو، اور زمین میں فساد نہ برپا کرتے پھرو۔ اللہ کی عنایت سے کاروبار میں جو بچت ہو وہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم مومن ہو، اور میں تمہارے اوپر کوئی نگہبان نہیں ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت

باپ داداسے ہوتی چلی آرہی ہے۔ یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں؟ تم ہی تو ایک بُردبار اور راستباز رہ گئے ہو

آخری خط کشیدہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ ربوبیت والوہیت کے بارے میں ان کی اصل گمراہی کیا تھی۔

فرعون وآل فرعون اب ہمیں فرعون اور اس کی قوم کو دیکھنا چاہیے جس کے باب میں نمرود اور اس کی قوم سے بھی زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ فرعون نہ صرف خدا کی ہستی کا منکر تھا بلکہ خود خدا ہونے کا مدعی تھا، یعنی اس کا دماغ اتنا خراب ہو گیا تھا کہ وہ دنیا کے سامنے کھلم کھلا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں خالق ارض وسما ہوں، اور اس کی قوم اتنی پاگل تھی کہ اس کے اس دعوے پر ایمان لاتی تھی۔ حالانکہ قرآن اور تاریخ کی شہادت سے اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ الوہیت و ربوبیت کے باب میں اس کی گمراہی نمرود کی گمراہی سے اور اس کی قوم کی گمراہی قوم نمرود کی گمراہی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، فرق جو کچھ تھا وہ صرف اس بنا پر تھا کہ یہاں سیاسی اسباب سے بنی اسرائیل کے ساتھ ایک قوم پرستانہ ضد اور متعصبانہ ہٹ دھرمی پیدا ہو گئی تھی اس لیے محض عناد کی بنا پر اللہ کو الٰہ اور رب ماننے سے انکار کیا جاتا تھا اگرچہ دلوں میں اس کا اقرار

چھپا ہوا تھا جیسا کہ آج کل بھی اکثر دہریوں کا حال ہے۔

اصل واقعات یہ ہیں کہ حضرت یوسف کو جب مصر میں اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے اپنی پوری قوت اسلام کی تعلیم کو پھیلانے میں صرف کر دی اور سرزمین مصر پر اتنا گہرا نقش مرتسم کیا کہ صدیوں تک کسی کے مٹائے نہ مٹ سکا۔ اس وقت چاہے تمام اہل مصر نے دین حق قبول نہ کر لیا ہو، مگر یہ ناممکن تھا کہ مصر میں کوئی شخص اللہ سے ناواقف رہ گیا ہو اور یہ نہ جان گیا ہو کہ وہی خالق ارض و سما ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کا کم سے کم اتنا اثر ہر مصری پر ضرور ہو گیا تھا کہ وہ فوق الفطری معنوں میں اللہ کو الٰہ الآلہہ اور رب الارباب تسلیم کرتا تھا، یعنی کوئی مصری اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا منکر نہ رہا تھا، البتہ جو ان میں کفر پر قائم رہ گئے تھے وہ الوہیت و ربوبیت میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے۔ یہ اثرات حضرت موسیٰ کی بعثت کے وقت تک باقی تھے، چنانچہ اس کا صریح ثبوت وہ تقریر ہے جو فرعونِ موسیٰ کے دربار میں ایک قبطی سردار نے کی تھی۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کے دربار کا یہ امیر جو مسلمان ہو چکا تھا مگر اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھا، بے قرار ہو کر بول اٹھا:

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۔ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ .... يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۙ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَ	کیا تم ایک شخص کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے حالانکہ وہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے سامنے کھلی کھلی نشانیاں لایا ہے؟ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اس پر ضرور پڑے گا، لیکن اگر وہ سچا ہے تو جس انجام سے وہ تمھیں ڈرا رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر نازل ہو کر رہے گا۔ یقین جانو کہ اللہ کسی حد سے بڑھے ہوئے جھوٹے آدمی کو فلاح کا راستہ نہیں دکھاتا۔ اے برادرانِ قوم! آج تمھارے ہاتھ میں حکومت ہے، زمین میں تم غالب ہو، مگر کل اللہ کا عذاب ہم پر آجائے

الَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ... وَلَقَدْ جَآءَكُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا .... وَیٰقَوْمِ مَا لِیْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِ. تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ٘ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ۔

(المومن ۴-۵)

تو کون ہماری مدد کرے گا؟ .... اے برادرانِ قوم! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر وہ دن نہ آجائے جو بڑی بڑی قوموں پر آچکا ہے، اور وہی انجام تمہارا نہ ہو جو قومِ نوح اور عاد اور ثمود اور بعد کی قوموں کا ہوا .... اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تو تم اس چیز کے متعلق شک میں پڑے رہے جسے وہ لائے تھے پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا کہ اللہ ان کے بعد کوئی رسول نہ بھیجے گا .... اور اے برادرانِ قوم! یہ عجیب معاملہ ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو، تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ اُن کو شریک ٹھیراؤں جن کے شریک ہونے پر میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں ہے، اور میں تمہیں اُس کی طرف بلاتا ہوں جو سب سے زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔

یہ پوری تقریر اس بات پر شاہد ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عظیم الشان شخصیت کا اثر کئی صدیاں گذر جانے کے باوجود اس وقت تک باقی تھا اور اس جلیل القدر نبی کی تعلیم سے متاثر ہونے کے باعث یہ قوم جہالت کے اس مرتبے پر نہ تھی کہ اللہ کی ہستی سے بالکل ہی ناواقف ہوتی یا یہ نہ جانتی کہ اللہ رب اور الٰہ ہے اور قوائے فطرت پر اس کا غلبہ و قہر قائم ہے اور اس کا غضب کوئی ڈرنے کی چیز ہے۔ نیز اس کے آخری فقرے سے یہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اللہ کی الوہیت و ربوبیت کی قطعی منکر نہ تھی، بلکہ اس کی گمراہی وہی تھی جو دوسری قوموں کی بیان ہو چکی ہے، یعنی ان دونوں حیثیتوں میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھیرانا۔

شبہ جس وجہ سے واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فرعون حضرت موسیٰ کی زبان سے اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (ہم العالمین کے رسول ہیں) سن کر پوچھتا ہے وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (رب العالمین کیا چیز ہے؟)، اپنے

وزیر ہامان سے کہتا ہے کہ میرے لیے ایک اونچی عمارت بنا کہ میں موسیٰ کے الٰہ کو دیکھوں، حضرت موسیٰ کو دھمکی دیتا ہے کہ میرے سوا کسی اور کو تم نے الٰہ بنایا تو میں تمھیں قید کردوں گا، ملک بھر میں اعلان کرتا ہے کہ میں تمھارا رب اعلیٰ ہوں، اپنے درباریوں سے کہتا ہے کہ میں اپنے سوا تمھارے کسی الٰہ کو نہیں جانتا۔ اس قسم کے فقرات دیکھ کر لوگوں کو گمان ہوا ہے کہ شاید وہ اللہ کی ہستی ہی کا منکر تھا، رب العالمین کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھا، اور اپنے آپ ہی کو واحد معبود سمجھتا تھا۔ مگر اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہ تمام باتیں قوم پرستانہ ضد کی وجہ سے تھیں۔ حضرت یوسف کے زمانہ میں صرف یہی نہ ہوا تھا کہ آنجناب کی زبردست شخصیت کے اثر سے اسلام کی تعلیمات مصر میں پھیل گئی تھیں، بلکہ حکومت میں جو اقتدار ان کو حاصل ہوا تھا اس کی بدولت بنی اسرائیل مصر میں بہت باا‌ثر ہوگئے تھے۔ تین چار سو سال تک یہ اسرائیلی اقتدار مصر پر چھایا رہا۔ پھر وہاں اسرائیلیوں کے خلاف قوم پرستانہ جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے یہاں تک کہ ان کے اقتدار کو اُلٹ پھینکا گیا اور مصری قوم پرست خاندان یکے بعد دیگرے فرمانروا ہوتے چلے گئے۔ ان نئے فرماں رواؤں نے محض اسرائیلیوں کو دبانے اور کچلنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ دورِ یوسفی کے ایک ایک اثر کو مٹانے اور اپنے قدیم جاہلی مذہب کی روایات کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس حالت میں جب حضرت موسیٰ تشریف لائے تو ان لوگوں کو خطرہ ہوا کہ کہیں اقتدار پھر ہمارے ہاتھ سے نکل کر اسرائیلیوں کے ہاتھ میں نہ چلا جائے۔ یہی عناد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ تھا جس کی بنا پر فرعون چِڑ چِڑ کر حضرت موسیٰ سے پوچھتا تھا کہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ میرے سوا اور الٰہ کون ہوسکتا ہے؟ ورنہ در اصل وہ رب العالمین سے بے خبر نہ تھا۔ اس کی اور اس کے اہل دربار کی جو گفتگوئیں اور حضرت موسیٰ کی جو تقریریں قرآن میں آئی ہیں، اُن سب سے یہ حقیقت بیّن طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک موقع پر فرعون اپنی قوم کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ موسیٰ خدا کے پیغمبر نہیں ہیں کہتا ہے:

فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّن ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلَائِكَةُ مُقْتَرِنِينَ (الزخرف ۵۳)	تو کیوں نہ اس کے لیے سونے کے کنگن اُتارے گئے یا فرشتے صف بستہ ہو کر اس کے ساتھ کیوں نہ آئے؟

کیا یہ بات ایک ایسا شخص کہہ سکتا تھا جو اللہ اور ملائکہ کے تصور سے خالی الذہن ہوتا؟ ایک اور موقع پر فرعون اور حضرت موسیٰ کے درمیان یہ گفتگو ہوتی ہے:

فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَىٰ مَسْحُورًا ۞ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنزَلَ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا (بنی اسرائیل - ۱۲)

فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو سمجھتا ہوں کہ تیری عقل خبط ہو گئی ہے۔ موسیٰ نے جواب دیا تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں رب زمین و آسمان کے سوا کسی اور کی نازل کی ہوئی نہیں ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ اے فرعون تیری شامت آ ہی گئی ہے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ فرعونیوں کی قلبی حالت اس طرح بیان فرماتا ہے:

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۞ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (النمل - ۱)

جب ہماری نشانیاں اُن کے سامنے علانیہ نمایاں ہوئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ ان کے دل اندر سے قائل ہو چکے تھے مگر انھوں نے محض شرارت اور تکبر و سرکشی کی بنا پر ماننے سے انکار کیا۔

ایک اور مجلس کا نقشہ قرآن یوں کھینچتا ہے:

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُم بِعَذَابٍ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرَىٰ ۞ فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُم بَيْنَهُمْ وَأَسَرُّوا النَّجْوَىٰ ۞ قَالُوا إِنْ هَٰذَانِ لَسَاحِرَانِ يُرِيدَانِ أَن يُخْرِجَاكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ - (طٰہٰ - ۳)

موسیٰ نے ان سے کہا تم پر افسوس ہے، اللہ پر جھوٹے افترا نہ باندھو ورنہ وہ سخت عذاب سے تمھیں تباہ کر دے گا اور افترا جس نے بھی باندھا ہے وہ نامراد ہو کر ہی رہا ہے۔ یہ سن کر وہ لوگ آپس میں رد و کد کرنے لگے اور خفیہ مشورہ ہوا جس میں کہنے والوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰ و ہارون) تو جادوگر ہیں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمھارے مثالی (آئیڈیل) طریق زندگی کو مٹا دیں۔

ظاہر ہے کہ اللہ کے عذاب سے ڈرانے اور افترا کے انجام سے خبردار کرنے پر ان کے درمیان ردّ وکد اسی لیے شروع ہوگئی تھی کہ ان لوگوں کے دلوں میں کہیں تھوڑا بہت اثر خدا کی عظمت اور اس کے خوف کا موجود تھا، لیکن جب اُن کے قوم پرست حکمراں طبقہ نے سیاسی انقلاب کا خطرہ پیش کیا اور کہا کہ موسیٰ اور ہارون کی بات ماننے کا انجام یہ ہوگا کہ مصریت پھر اسرائیلیت سے مغلوب ہو جائے گی تو ان کے دل پھر سخت ہوگئے اور ان سب نے بالاتفاق رسولوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ہم بآسانی یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان اصل جھگڑا کس بات پر تھا، فرعون اور اس کی قوم کی حقیقی گمراہی کس نوعیت کی تھی، اور فرعون کس معنی میں الوہیت وربوبیت کا مدعی تھا۔ اس غرض کے لیے قرآن کی حسب ذیل آیات کو ترتیب وار ملاحظہ کیجیے:۔

(۱) فرعون کے درباریوں میں سے جو لوگ حضرت موسیٰ کی دعوت کا استیصال کرنے پر زور دیتے تھے وہ ایک موقع پر فرعون کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ (اعراف ۱۵)

کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائے اور آپکے الٰہوں کو چھوڑ دے؟

دوسری طرف انہی درباریوں میں سے جو شخص حضرت موسیٰ پر ایمان لے آیا تھا وہ ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

تَدْعُونَنِي لِأَكْفُرَ بِاللَّهِ وَأُشْرِكَ بِهِ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ (المومن ۵)

تم مجھے اس طرف بلاتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان کو شریک کروں جن کے شریک ہونے کے لیے میرے پاس کوئی علمی ثبوت نہیں۔

ان دونوں آیتوں کو جب ہم ان معلومات کے ساتھ ملا کر دیکھتے ہیں جو تاریخ وآثار قدیمہ کے ذریعہ سے ہمیں اُس زمانہ کے اہل مصر کے متعلق حاصل ہوئی ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فرعون خود بھی اور اس کی

قوم کے لوگ بھی ربوبیت کے پہلے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے بعض دیوتاؤں کو خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر فرعون فوق الفطری معنوں میں خدائی کا مدعی ہوتا، یعنی اگر اس کا دعویٰ یہی ہوتا کہ سلسلۂ اسباب پر وہ خود حکمراں ہے اور اس کے سوا کوئی زمین و آسمان کا اِلٰہ و رب نہیں ہے تو وہ دوسرے الٰہوں کی پرستش نہ کرتا۔[1]

(۲) فرعون کے یہ الفاظ جو قرآن میں نقل کیے گئے ہیں کہ:

يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (القصص ۴)	لوگو! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی الٰہ کو جانتا نہیں ہوں۔
لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء - ۲)	اے موسیٰ اگر میرے سوا تو نے کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔

ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرعون اپنے سوا دوسرے تمام الٰہوں کی نفی کرتا تھا، بلکہ اس کی اصل غرض حضرت موسیٰ کی دعوت کو رد کرنا تھا، چونکہ حضرت موسیٰ ایک ایسے الٰہ کی طرف بلا رہے تھے جو صرف فوق الفطری معنی ہی میں معبود نہیں ہے بلکہ سیاسی و تمدنی معنی میں امر و نہی کا مالک اور اقتدارِ اعلیٰ کا حامل بھی ہے اس لیے اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہارا ایسا الٰہ تو میرے سوا کوئی نہیں ہے، اور حضرت موسیٰ کو دھمکی دی کہ اس معنی میں میرے سوا کسی کو الٰہ بناؤ گے تو جیل کی ہوا کھاؤ گے۔

نیز قرآن کی ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے ، اور تاریخ و آثارِ قدیمہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ

---

[1] بعض مفسرین نے محض اس مفروضہ پر کہ فرعون خود اللہ العالمین ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا، سورہ اعراف کی مذکورۂ متن آیت میں اِلٰهَتَكَ کی قرأت اختیار کی ہے اور الٰهة کو بمعنی عبادت لیا ہے، یعنی ان کی قرأت کے مطابق آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "آپ کو اور آپ کی عبادت کو چھوڑ دے" لیکن اول تو یہ قرأت شاذ ہے اور معروف قرأت کے خلاف ہے، دوسرے وہ مفروضہ ہی سرے سے بے بنیاد ہے جس پر یہ قرأت اختیار کی گئی ہے، تیسرے الٰهة کے معنی عبادت کے علاوہ معبودہ یا دیوی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ سورج کے لیے عرب جاہلیت میں الٰهة ہی کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور یہ معلوم ہے کہ بالعموم مصریوں کا صنمِ اکبر سورج ہی تھا۔

فراعنۂ مصر محض حاکمیت مطلقہ (Absolute sovereignty) ہی کے مدعی نہ تھے بلکہ دیوتاؤں سے اپنا رشتہ جوڑ کر ایک طرح کی قدوسیت کا بھی دعویٰ رکھتے تھے تاکہ رعایا کے قلب و روح پر ان کی گرفت خوب مضبوط ہو جائے۔ اس معاملہ میں تنہا فراعنہ ہی منفرد نہیں ہیں، دنیا کے اکثر ملکوں میں شاہی خاندانوں نے سیاسی حاکمیت کے علاوہ فوق الفطری الوہیت و ربوبیت میں بھی کم و بیش حصہ بٹانے کی کوشش کی ہے اور رعیت کے لیے لازم کیا ہے کہ وہ ان کے آگے عبودیت کے کچھ نہ کچھ مراسم ادا کرے۔ لیکن دراصل یہ محض ایک ضمنی چیز ہے۔ اصل مقصد سیاسی حاکمیت کا استحکام ہوتا ہے اور اس کے لیے فوق الفطری الوہیت کا دعویٰ محض ایک تدبیر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مصر میں اور دوسرے جاہلیت پرست ملکوں میں بھی ہمیشہ سیاسی زوال کے ساتھ ہی شاہی خاندانوں کی الوہیت بھی ختم ہوتی رہی ہے، اور تخت جس جس کے پاس گیا ہے الوہیت بھی اسی کی طرف منتقل ہوتی چلی گئی ہے۔

(۳) فرعون کا اصلی دعویٰ فوق الفطری خدائی کا نہیں بلکہ سیاسی خدائی کا تھا۔ وہ ربوبیت کے تیسرے چوتھے اور پانچویں معنی کے لحاظ سے کہتا تھا کہ میں سرزمینِ مصر اور اس کے باشندوں کا ربِ اعلیٰ (Over-lord) ہوں، اس ملک اور اس کے تمام وسائل و ذرائع کا مالک میں ہوں، یہاں کی حاکمیتِ مطلقہ کا حق مجھ ہی کو پہنچتا ہے، یہاں کے تمدن و اجتماع کی اساس میری مرکزی شخصیت ہے، اور یہاں قانون میرے سوا کسی اور کا نہ چلے گا۔ قرآن کے الفاظ میں اس کے دعوے کی بنیاد یہ تھی:

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الزخرف۔ ۵)	اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی کہ اے قوم! کیا میں ملک مصر کا مالک نہیں ہوں اور یہ دریا میرے ماتحت نہیں بہتے ہیں؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟

یہ وہی بنیاد تھی جس پر نمرود کا دعوائے ربوبیت مبنی تھا (حَآجَّ اِبْرٰهِیْمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ) اور اسی بنیاد پر حضرت یوسف کا ہمعصر فرعون بھی اپنے اہل ملک کا رب بنا ہوا تھا۔

(۴) حضرت موسیٰ کی دعوت جس پر فرعون و آل فرعون سے ان کا جھگڑا تھا، دراصل یہ تھی کہ اللہ رب العالمین کے سوا کسی معنی میں بھی کوئی دوسرا الٰہ اور رب نہیں ہے، وہی تنہا فوق الفطری معنی میں بھی اللہ اور رب ہے اور سیاسی و اجتماعی معنی میں بھی۔ پرستش بھی اُسی کی ہو، بندگی و اطاعت بھی اسی کی، اور پیروی قانون بھی اسی کی۔ نیز یہ کہ صریح نشانیوں کے ساتھ اس نے مجھے اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے، میرے ذریعہ سے وہ اپنے امر و نہی کے احکام دے گا، لہٰذا اس کے بندوں کی عنان اقتدار تمہارے ہاتھ میں نہیں، میرے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اسی بنا پر فرعون اور اس کے اعیان حکومت بار بار کہتے تھے کہ یہ دونوں بھائی ہمیں زمین سے بے دخل کر کے خود قابض ہونا چاہتے ہیں اور ہمارے ملک کے نظام مذہب و تمدن کو مٹا کر اپنا نظام قائم کرنے کے درپے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ۔ (ہود – ۹)

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور صریح نشانِ ماموریت کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداران قوم کی طرف بھیجا تھا مگر ان لوگوں نے فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر راستی پر نہ تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ اَنْ اَدُّوْۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (الدخان – ۱)

ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ ایک معزز رسول انکے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو، میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں، اور اللہ کے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو، میں تمہارے سامنے صریح نشان ماموریت پیش کرتا ہوں۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا (المزمل – ۱)

(اے اہل مکہ) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہی دینے والا ہے، اسی طرح جیسے ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔ پھر فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے سختی کے ساتھ پکڑ

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوسٰى قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ - ۳)

فرعون نے کہا اے موسیٰ (اگر تم نہ دیوتاؤں کو رب مانتے ہو نہ شاہی خاندان کو) تو آخر تمھارا رب ہے کون ؟ موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو اس کی مخصوص ساخت عطا کی پھر اُسے اس کے کام کرنے کا طریقہ بتایا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ؟ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ - قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ؟ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ - قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ - قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ - قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ (الشعراء - ۱)

فرعون نے کہا اور یہ رب العالمین کیا ہے ؟ موسیٰ نے جواب دیا زمین و آسمان اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ فرعون اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے بولا سنتے ہو ؟ موسیٰ نے کہا تمھارا رب بھی اور تمھارے گذشتہ آبا و اجداد کا بھی۔ فرعون بولا تمھارے یہ رسول صاحب جو تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل ہیں۔ موسیٰ نے کہا مشرق اور مغرب اور ہر اس چیز کا رب جو ان کے درمیان ہے، اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔ اس پر فرعون بول اٹھا کہ اگر میرے سوا تو نے کسی کو الٰہ بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کر دوں گا۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوسٰى (طٰہٰ - ۳)

فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ ! کیا تو اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہماری زمین سے بے دخل کر دے ؟

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن - ۳)

اور فرعون نے کہا چھوڑ دو مجھے کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں، اور وہ اپنے رب کو مدد کے لیے پکار دیکھے۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ تمھارے دین کو بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا۔

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ

انھوں نے کہا کہ یہ دونوں تو جادوگر ہیں، چاہتے ہیں کہ اپنے

اَنْ یُّخْرِجَاکُمْ مِّنْ اَرْضِکُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ یَذْهَبَا بِطَرِیْقَتِکُمُ الْمُثْلٰی (طٰہٰ - ۳)	جادو کے زور سے تم کو تمھاری زمین سے بے دخل کردیں اور تمھارے مثالی طریق زندگی کو مٹادیں۔

ان تمام آیات کو ترتیب وار دیکھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ربوبیت کے باب میں وہی ایک گمراہی جو ابتدا سے دنیا کی مختلف قوموں میں چلی آرہی تھی، ارض نیل میں بھی ساری ظلمت اسی کی تھی، اور وہی ایک دعوت جو ابتدا سے تمام انبیاء دیتے چلے آرہے تھے، موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی اسی کی طرف بلاتے تھے۔ (باقی)

میلاد النبی

(یہ تقریر ۳۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی۔ اور باجازت آل انڈیا ریڈیو یہاں نقل کی جاتی ہے)

آج اس عظیم الشان انسان کا جنم دن ہے جو زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے رحمت بن کر آیا تھا اور وہ اصول اپنے ساتھ لایا تھا جن کی پیروی میں ہر فرد انسانی، ہر قوم و ملک، اور تمام نوعِ انسان کے لیے یکساں فلاح اور سلامتی ہے۔ یہ دن اگرچہ ہر سال آتا ہے، مگر اب کے سال یہ ایسے نازک موقع پر آیا ہے جب کہ زمین کے باشندے ہمیشہ سے بڑھ کر اُس دانائے کامل کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ معلوم نہیں مسٹر برنارڈ شا نے اچھی طرح جان بوجھ کر کہا تھا یا بے جانے بوجھے، مگر جو کچھ انھوں نے کہا وہ بالکل سچ تھا کہ محمدؐ اگر اس وقت دنیا کے ڈکٹیٹر ہوتے تو دنیا میں امن قائم ہو جاتا۔ میں اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں موجود نہ سہی، ان کے پیش کردہ اصول تو بے کم و کاست موجود ہیں، ان کے اصولوں کو بھی اگر ہم راستبازی کے ساتھ ڈکٹیٹر مان لیں تو وہ سارے فتنے ختم ہو سکتے ہیں جن کی آگ سے آج نسلِ آدم کا گھر جہنم بنا ہوا ہے۔

اب سے چودہ سو برس پہلے جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قدم رکھا تھا اس وقت خود ان کا اپنا وطن اخلاقی پستی، بدنظمی اور بدامنی کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ قرآن میں اس وقت کی حالت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے کہ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے جس سے خدا نے تمھیں بچایا۔ اس سے کچھ بہتر حالت دنیا کے دوسرے ملکوں کی نہ تھی۔ ایران اور مشرقی رومی سلطنت اُس وقت انسانی تہذیب کے دو سب سے بڑے گہوارے تھے۔ اور ان دونوں کو ایک طرف آپس کی پیہم لڑائی اور دوسری طرف خود اپنے گھر کے معاشرتی امتیازات، معاشی ناہمواری اور مذہبی جھگڑوں نے تباہ کر رکھا تھا۔ ان حالات میں محمد صلی

اللہ علیہ وسلم اٹھے اور تیئیس برس کے اندر انھوں نے نہ صرف عرب کو بدل ڈالا بلکہ ان کی رہنمائی میں عرب سے جو تحریک اٹھی تھی اس نے ایک چوتھائی صدی کے اندر ہندوستان کی سرحدوں سے شمالی افریقہ تک دنیا کے ایک بڑے حصہ کو اخلاق، تمدن، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبہ زندگی میں درست کر کے رکھدیا۔

یہ اصلاح کیوں کر ہوئی، ایک مختصر گفتگو میں اس کی ساری تفصیلات بیان کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس کے موٹے موٹے اصول میں آپ کے سامنے بیان کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جس پر انھوں نے زور دیا وہ یہ تھی کہ تمام انسان صرف خدائے واحد کو اپنا آقا، مالک، معبود اور حاکم تسلیم کریں، خدا کے سوا کسی کی بندگی قبول نہ کریں، اور صرف مذہب کے محدود دائرے ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے سارے معاملات میں تنہا خدا کے اقتدار اعلیٰ کے آگے جھک جائیں۔

اس کے ساتھ دوسری اہم چیز ان کی تعلیم میں یہ تھی کہ انسان کی مطلق العنانی اور غیر ذمہ داری کو بالکل ختم کر دیا جائے، ہر انسان فرداً فرداً اور انسانی جماعتیں، خواہ وہ خاندانوں اور قبیلوں کی شکل میں ہوں یا طبقات کی شکل میں، خواہ قوموں کی شکل میں ہوں یا ریاستوں اور حکومتوں کی شکل میں، بہر حال سب کے سب اپنے آپ کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھیں۔ انھوں نے انسان کا تصور ہی یہ پیش کیا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ یا نائب ہے۔ اس کو جس قدر اور جس حیثیت میں بھی کچھ اختیارات حاصل ہیں دراصل وہ اس کے ذاتی اختیارات نہیں ہیں بلکہ خدا کے دیے ہوئے ہیں اور ان کے استعمال میں وہ بالآخر خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

خدائی اقتدار اعلیٰ اور انسانی خلافت کی بنیاد پر محمد، صلی اللہ علیہ وسلم نے نوعِ انسانی کے درمیان منصفانہ وحدت و اتفاق کا وہ رشتہ فراہم کیا جو کسی دوسرے ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ نسل و نسب، زبان، رنگ، وطن، معاشی مفاد اور دوسری جتنی چیزیں سوسائٹی کی بنیاد بنتی ہیں وہ لازمی طور پر انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کا مدمقابل بنا دیتی ہیں۔ ان میں اگر موافقت ہوتی بھی ہے تو اغراض کی بنا پر

ایک ناپائیدار عارضی موافقت ہوتی ہے۔ کشمکش اور جنگ اس تقسیم کی عین فطرت میں داخل ہے اور اس کا لازمی نتیجہ بے انصافی ہے۔ اس کو دور کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ تمام انسانوں کو خدا کی بندگی پر متحد کیا جائے اور خدا کے سامنے جواب دہ ہونے کا احساس پیدا کر کے انصاف پر آمادہ کیا جائے۔

قومیت اور طبقات کے بجائے خدا کی بندگی اور خلافت کے تصور پر جس عالمگیر سماجی زندگی کی بنیاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اس کے ہر پہلو کو انھوں نے پائیدار اخلاقی اصولوں پر ڈھال دیا۔ ان کے اخلاقیات تارک الدنیا درویشوں کے لیے نہیں تھے بلکہ دنیا کا کام چلانے والے لوگوں کے لیے تھے۔ کسان، زمیندار، مزدور، کارخانہ دار، تاجر، خریدار، پولیس مین، مجسٹریٹ، کلکٹر، جج، گورنر، سپاہی اور سپہ سالار، وزیر اور سفیر ہر ایک کو اس کے دائرۂ عمل میں انھوں نے اخلاق کے ایسے ضابطوں سے باندھ دیا جس کی بندشوں کو کھولنا اور کسنا، جس کے اصولوں کو بنانا اور بگاڑنا افراد یا رائے عام کی خواہشات پر منحصر نہیں تھا۔ انھوں نے معاشرت اور شخصی تعلقات کو، آرٹ اور ادب کو، کاروبار اور لین دین کو، سیاست اور انتظام ملکی کو، بین الاقوامی تعلقات اور صلح و جنگ کو، غرض انسانی زندگی کے سارے معاملات کو، اخلاق کا پابند بنایا اور جو چیز بھی انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہو اس کا یہ حق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر نشوونما پائے۔

یہ وہ بڑے بڑے اصول تھے جن پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلاحی پروگرام مبنی تھا۔ اس پروگرام کو عمل میں لانے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ انفرادی اصلاح سے شروع ہوتا تھا۔ ان کی نگاہ سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ اجتماعی اصلاح کے ہر نقشہ کا دارومدار بالآخر افراد ہی پر جا کر ٹھیرتا ہے۔ کسی بہتر سے بہتر نظام کو بھی کمزور کیرکٹر اور ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگوں کو لے کر کامیابی کے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ افراد کی سیرت کی خامیوں سے ایک نظام کے عمل درآمد میں جو رخنے اور شگاف پڑتے ہیں، انھیں کاغذ پر نہیں بھرا جا سکتا۔ کاغذ کی دنیا میں آپ مختلف ممکن خرابیوں کے سدباب کا جس قدر چاہیں خیالی انتظام کریں، لیکن عمل کی دنیا میں اس کاغذی نقشہ کو

چلانے کا انحصار جن افراد پر ہے وہ اگر خواہشات، اغراض اور تعصبات سے شکست کھا جانے والے لوگ ہوں، ان میں اگر سچا ایمان اور پختہ کیرکٹر نہ ہو تو آپ کی ساری خیالی احتیاطوں کے باوجود اس نظام میں رخنے پڑیں گے اور ایسی ایسی جگہوں سے پڑیں گے جہاں تک آپ کا تصور بھی نہ جا سکے گا۔ بخلاف اس کے کاغذ پر ایک نظام کو دیکھ کر آپ اس میں بہت سے رخنوں کا امکان ثابت کر سکتے ہیں، لیکن اس کو چلانے کے لیے اگر بھروسے کے قابل افراد موجود ہوں تو ان کا صحیح عمل ان سارے رخنوں کو بھر دے گا جن کے رونما ہونے کا امکان عالم خیال میں آپ کو نظر آتا ہو۔

اسی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی ساری قوت ایسے افراد کو تیار کرنے پر صرف کی جو ان کے پروگرام کے مطابق بہترین طریقہ پر دنیا کی اصلاح کر سکتے ہوں۔ انھوں نے ایسے لوگ تیار کیے جو ہر حال میں خدا سے ڈر کر بدی سے پرہیز کرنے والے ہوں، جو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو پیش نظر رکھنے والے ہوں، جو ہر اس کام سے رک جانے والے ہوں جس کے متعلق انھیں خدا کی ناراضی کا اندیشہ ہو اور ہر اس کام میں دل و جان سے کوشش کرنے والے ہوں جس کے متعلق انھیں معلوم ہو جائے کہ خدا اس سے خوش ہوگا۔ جنھیں خدا کی خوشنودی پر اپنی کسی چیز کو قربان کرنے میں تامل نہ ہو، جن کے دل میں خدا کے سوا کسی کا خوف کسی کی مہربانی کا لالچ اور کسی کے انعام کی تمنا نہ ہو، جن کے لیے پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کوئی فرق نہ ہو، جو راز کے پردوں میں بھی اتنے ہی نیک، شریف، اور پرہیزگار رہیں جتنے پبلک میں منظر عام پر نظر آئیں، جن پر یہ بھروسہ کیا جا سکے کہ بندگان خدا کی جان، مال، آبرو اگر ان کے چارج میں دیدی جائے تو خیانت کار ثابت نہ ہوں گے، اپنی ذات یا اپنی قوم و حکومت کی طرف سے کوئی عہد کریں تو بے وفا نہ نکلیں گے، انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں تو ظالم نہ پائے جائیں گے، لین دین کے بازار میں بیٹھیں تو بدمعاملگی نہ کریں گے، حق مانگنے میں خواہ سست ہوں مگر حق ادا کرنے میں سست نہ ہوں گے، اور اپنی ذہانت، ہوشیاری، تدبر اور قوت و قابلیت کو راستی اور انصاف کے لیے اور انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کریں گے نہ کہ شخصی یا قومی اغراض کی خاطر دوسروں کو بے وقوف بنانے

اور دوسروں کے حق تلف کرنے کے لیے۔

کامل پندرہ سال ایسے افراد کی تیاری میں صرف کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حق پرستوں کی ایک مٹھی بھر جماعت تیار کی، جو صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کی اصلاح کے لیے سچا عزم رکھتی تھی اور جس میں عرب کے علاوہ دوسری قوموں کے بھی افراد شامل تھے۔ اس جماعت کو منظم کرنے کے بعد انھوں نے وسیع پیمانہ پر سماج کی اصلاح کے لیے عملی جدوجہد شروع کی اور صرف آٹھ برس میں پندرہ لاکھ مربع میل پھیلی ہوئی سرزمین عرب کے اندر مکمل اخلاقی، معاشی، تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کر کے رکھ دیا۔ پھر وہی جماعت جسے انھوں نے منظم کیا تھا عرب کی اصلاح سے فارغ ہو کر آگے بڑھی اور اس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بیشتر حصے کو اس انقلاب کی برکتوں سے مالا مال کر دیا جو عرب میں رونما ہوا تھا۔

آج ہم نئے نظام نئے نظام (نیو آڈر) کی آوازیں ہر طرف سے سن رہے ہیں لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ جن بنیادی خرابیوں نے پرانے نظام کو آخر کار فتنہ بنا کر چھوڑا وہی اگر صورت بدل کر کسی نئے نظام میں بھی موجود ہوں تو وہ نیا نظام ہوا کب۔ وہ تو وہی پرانا نظام ہو گا جس کے کاٹنے اور ڈسنے سے جاں بلب ہو جانے کے بعد ہم نئے نظام کا تریاق مانگ رہے ہیں۔ انسانی اقتدار اعلیٰ، خدا سے بے نیازی و بے خوفی، قومی و نسلی امتیازات، ملکوں اور قوموں اور طبقوں کی سیاسی و معاشی خود غرضیاں، اور ناخدا ترس افراد کا دنیا میں برسر اقتدار ہونا، یہ ہیں وہ اصلی خرابیاں جو اس وقت تک نوع انسانی کو تباہ کرتی رہی ہیں۔ اور آئندہ بھی اگر ہماری زندگی کا نظام انہی خرابیوں کا شکار رہا تو یہ ہمیں تباہ کرتی رہیں گی۔ اِصلاح اگر ہو سکتی ہے تو انہی اصولوں پر ہو سکتی ہے جن کی طرف انسانیت کے ایک سچے بہی خواہ نے اب سے صدیوں پہلے ہماری محض رہنمائی ہی نہ کی تھی بلکہ عملاً اصلاح کر کے دکھا دی تھی۔

ہیگل مارکس اور اسلامی نظام

(بقیہ باب ششم)

سود کی ممانعت سود کو ممنوع قرار دے کر اسلام نے معاشی زندگی کے ایک بڑے مفسدہ کو جڑ سے مٹا دیا۔ سود کی وجہ سے زر پرست ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور اُن کی گاڑھی کمائی سے اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں۔ سود کا عام رواج دولت کی نامساوی تقسیم کا بھی سبب ہے جس سوسائٹی میں یہ رواج عام ہوگا اُس پر ہمیشہ طبقہ داری کشمکش اور غربت و فلاکت کی لعنت مسلط رہے گی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام نے ہر طرح کے سود کو ممنوع قرار دیا ہے خواہ وہ تجارتی اور کاروباری سود ہو یا اس کی نوعیت کچھ اور ہو۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے جیسا کہ آج کل بہت سے تجدد پسند کہا کرتے ہیں کہ تجارتی اور معاشی کاروبار کے سلسلہ میں جو سود دیا جاتا ہے اس کی نوعیت اس سود سے مختلف ہے جس کی ممانعت اسلام نے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی کاروباری سود چیز ہی دوسری ہے وہ شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ موجودہ ظالمانہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہی سود ہے۔ اگر آج حکومتیں سود کو ممنوع قرار دیدیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ سود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے اُسے کاروبار کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہ سود کی معینہ رقم حاصل کرنے پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ کاروبار سے منفعت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن نقصان کی صورت میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ سود کے بغیر سرمایہ کی فراہمی محال ہوگی اور بغیر سرمایہ کے بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو چلانا محال ہوگا حقیقتاً اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر سود کو مٹا کر اس کی جگہ منافع (Profits) کی بنیاد پر معاشی تنظیم استوار کی جائے تو اس کی وجہ سے موجودہ زمانہ کی بے شمار معاشی خرابیاں اصلاح پذیر ہو سکتی ہیں۔ سود اور منافع میں بڑا فرق یہ ہے کہ سود ایک معینہ رقم ہے لیکن منافع میں رقم کا تعین نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی جمع کی ہوئی رقم پر پانچ فی صدی سود حاصل کر سکتا ہے تو اسے بالکل ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ سال کے ختم پر اتنی رقم ملے گی۔ لیکن اگر کاروبار اصولِ منفعت پر چل رہا ہو اور اسے بتا دیا جائے کہ منافع کا اتنا فی صدی حصہ تمھیں ملے گا تب بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے ختم سال پر کیا ملے گا۔ کیونکہ پہلے تو وہ یہی نہیں جانتا ہے کہ تجارت کو نفع ہوگا یا نقصان۔ اور اگر نفع کا یقین بھی ہے تو بھی وہ اپنے حصہ کا تعین نہیں کر سکتا۔

سود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں (Investors) کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے۔ انھیں تو سال کے ختم پر سود کی وصولی سے مطلب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنکھ بند کر کے وہ اپنا روپیہ بنکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بنکوں کی پالیسی پر انھیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بنک کی کارروائیوں پر انھیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ اُن کا کوئی نمائندہ بینک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے کم از کم ان لاتعداد روپیہ لگانے والوں کی حد تک یہ بالکل صحیح ہے جن کا تعلق سرمایہ داروں کے گروہ سے نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بینک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد واغراض کا تابع رہتا ہے۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے روپیہ لگانے والوں کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ بینک جس طرح چاہتے ہیں ان کا روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اس طرح بینکروں کے ہاتھ میں ایک ایسی قوت آجاتی ہے جسے وہ اپنے ہم طبقہ سرمایہ داروں کے مفاد واغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پھر چونکہ بینکنگ کا پورا نظام ایک محدود جماعت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے بطور لازمی نتیجہ کے ساری تجارت وصنعت اور سارے مالی ذرائع (Financial resources) پر بھی یہی محدود جماعت قابض ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بینکنگ کا نظام تجارت وصنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی تجارت

اور صنعت بینکوں کے تعاون یا ان کی امداد کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی ہے ۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے ۔ مالی نظام جس طبقہ کے ہاتھ میں ہوگا تجارت و صنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہوگا ۔ اسی صورت حال سے متاثر ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطور طنز لکھا ہے کہ بینک آف انگلینڈ کا صدر زار روس سے کئی گنا زیادہ اقتدار و اختیارات کا مالک ہوتا ہے ۔ یہ استعارہ نہیں ہے حقیقت ہے ۔

اگر سود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع پر رکھی جائے تو ہر شخص اپنا روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط اور دیکھ بھال سے کام لے گا کیونکہ اس صورت میں وہ صرف نفع کا شریک نہ ہوگا بلکہ نقصان میں بھی اُسے شرکت کرنا پڑے گی ۔ مجبور ہو کر روپیہ لگانے والے بینک کے انتظام میں موثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بینک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر ہر وقت نظر رکھیں گے ۔ ساہوکاروں کی طاقت اس طرح بہت کم ہو جائے گی ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روپیہ لگانے والے صرف ایسے ہی کاروبار و صنعتوں میں اپنا روپیہ لگائیں گے جن کی ملک کو واقعی ضرورت ہو اور جن کی پیداوار کے لیے پہلے ہی سے بازار میں مانگ موجود ہو ۔ ایسا نہ کرنے سے انھیں نقصان کا اندیشہ ہوگا ۔ یہ نہ ہوگا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ سرمایہ ایسی پیداوار پر صرف کیا جائے جس کی مانگ بازار میں نہیں ، پھر اس پیداوار کی نکاسی کے لیے مصنوعی طلب پیدا کی جائے (To create demand) ۔ اب ہوتا یہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ اپنے فاضل سرمایہ سے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے ایسی نئی نئی اشیا بنانے میں صرف کرتا ہے جن کی مانگ نہیں ہوتی ہے ۔ پھر اس خوف سے کہ مبادا اس پیداوار کی کھپت نہ ہو اشتہار بازی اور دیگر جائز و ناجائز طریقوں سے لوگوں میں نئی نئی خواہشات پیدا کی جاتی ہیں اور مصنوعی طور سے اُن کی ضروریات کو بڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ ان اشیاء کی خریداری پر مائل ہوں حالانکہ در اصل انھیں ان اشیاء کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اور اسی وجہ سے ان چیزوں کی مانگ بھی پہلے سے نہیں ہوتی ۔ یہ چیز بھی براہ راست موجودہ بینک کاری (Banking) کے نظام کا نتیجہ ہے ۔ کیونکہ اہل صنعت (Industrialists) کو بینکوں کی وجہ سے بآسانی سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے بینکوں پر بھی سرمایہ داروں کا قبضہ ہے اور صنعت پر بھی ۔ اس لیے معاشی زندگی کے ان دونوں ستونوں کی

ملی بھگت رہتی ہے۔

لیکن اگر سود کے بجائے منافع پر صنعتی اور مالی نظام چلایا جائے تو یہ صورت حال باقی نہیں رہے گی۔ منافع پر کاروبار کی صورت میں روپیہ لگانے والے مجبور ہوں گے کہ وہ یا تو خود کسی طریقہ سے بینکوں کے حساب وکتاب پر نگرانی رکھیں یا حکومت سے اس بات کا مطالبہ کریں کہ وہ بینکوں کے حسابات کی جانچ پڑتال اور تنقیح کے لیے عمال مقرر کرے۔ دوسری صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ بینک کاری افراد کے ہاتھ سے نکل کر حکومت کے ہاتھ میں آجائے گی یا کم از کم بینکوں پر اس کی موثر نگرانی قائم ہو جائے گی۔ اس طرح بے قید سرمایہ داری کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اگر بینک کاری کا نظام اس طرح سر بالکلیہ حکومت کے ہاتھ میں آجائے تو حکومت پوری صنعتی اور معاشی زندگی کو اپنی موثر نگرانی میں لے سکے گی۔ کیونکہ بینک کاری معاشی نظام کی شہ رگ ہے۔ لیکن یہ اُسی صورت میں مفید ہوگا جب خود حکومت پر عوام الناس کے حقیقی نمائندوں کا قبضہ ہو۔ یعنی ان لوگوں کا جو دل وجان سے عوام کی فلاح و بہبود کے خواہاں ہوں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بینک کاری نظام تو حکومت کے ہاتھ میں ہو لیکن روپیہ لگانے والے بھی نگرانی اور مشاورت کی غرض سے مجالس انتظامی میں اپنے منتخب نمائندے بھیجیں تاکہ یہ نظام، حکومت اور افراد کے باہمی تعاون پر مبنی ہو۔

اکتناز مال کی ممانعت غیر متوازن اور بے قید سرمایہ داری کو مٹانے کی غرض سے اسلام نے اکتنازِ مال Accumulation of wealth کو قطعاً ممنوع قرار دیا۔ چنانچہ کلام مجید نے صریح الفاظ میں اعلان کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	ان لوگوں کو سخت عذاب کی خوشخبری سنا دو جو
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس میں کا کوئی حصہ خدا
اَلِيْمٍ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى	کی راہ میں صرف نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا جب ان کے
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ	چہرے اور پیشانیاں اسی سونے چاندی سے داغی

چیز اشتراکی نظام اور اسلام کے مابین وجہ امتیاز ہے۔

اشتراکیت نے معاشی زندگی کو سُدھارنے کے لیے صرف خارج میں ضابطہ بندیاں کرنے پر انحصار کر لیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ضابطہ محض جبر اور مادّی طاقت کے بل پر قائم ہوتا ہے اور جو نظام محض زور و طاقت اور جبر پر قائم ہو اس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ تمدن کے کسی ضابطہ کو بقا و دوام نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ جمہور کے اپنے دلوں میں بھی اُس مقصد کے حصول کی لگن نہ ہو جسے قانون و ضابطہ بزور و جبر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اشتراکی نظام انسان کی پوری معاشی زندگی کو ضابطہ و قانون کی بندش میں جکڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس زندگی کے کسی گوشے میں بھی انسان کے ارادے اور مرضی کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے تحت انسان کے اخلاقی احساسات حالتِ تعطّل میں رہیں گے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود و تعطّل اس کی موت ہے۔ جس دنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز و اقربا کی امداد، غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں، جہاں کسی شخص کو انفرادی طور سے اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے، کسی کے کام آنے، کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقعہ نہ ہو جس جماعت کے افراد باہمی معاملات اور آپس کے تعلقات میں ایثار و قربانی کی روح سے خالی ہوں، اس میں اخلاقی احساسات کا نشوونما غیر ممکن ہے۔ چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہوگا اور نہ کوئی شخص دوسروں کی امداد کو اپنا اخلاقی فرض خیال کرے گا اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غربا کی اعانت، حاجتمندوں کی حاجت روائی، اور بیماروں کی عیادت و خبر گیری، اور اسی نوع کے دیگر انسانی خصائل یکسر ناپید ہو جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں اجتماعی ادارے ان فرائض کو سرانجام دیں گے۔ لیکن اول تو اجتماعی امداد شخصی اعانت کا بدل نہیں ہو سکتی، دوسرے جب افراد میں انفرادی طور پر اس صنفِ اخلاق کا نشوونما بند ہو جائے گا تو اجتماعی اداروں کو وہ آدمی مل کہاں سکیں گے جن کے دل دوسروں

کے لیے رحم و شفقت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے لبریز ہوں؟ شخصی اعانت اخلاقی احساس کی بیداری اور حرکت کا پیمانہ ہے۔ اجتماعی امداد اور اخلاقی احساس کے مابین کوئی لازمی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ قائم شدہ روایات، عام رائے کا دباؤ یا محض جذبۂ تقلید اس نوع کی امداد کا محرک ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شخصی اعانت کا جذبہ صرف اخلاقی احساس سے تحریک پاتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ و قانون کی طاقت کے حوالے کرکے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے، اور اس کے تصورات کی اصلاح، اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل، اور ایک مناسب اجتماعی ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ آزاد عمل غلط سمت میں نہ جائے۔ اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور با اختیار ارادہ کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے۔ اگر اشتراکیت کی طرح اسلام نے بھی جملہ معاشی امور کو قانون اور حکومت کے قبضہ میں دیدیا ہوتا تو پھر اس اخلاقی آزمائش کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ جو شخص قانون کی رو سے اس بات پر مجبور ہو کہ اپنی کمائی ایک لاشخصی (Impersonal) ادارہ کے حوالہ کردے اور پھر اس میں سے صرف اتنا ہی حصہ واپس لے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو اُس پر اخلاقی اچھائی یا بُرائی کا حکم کس طرح لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس عمل میں اس کا آزاد ارادہ نہیں بلکہ قانون کا خوف کام کر رہا ہے۔ البتہ اگر حکومت اور قانون کے خوف سے بے پروا ہو کر اُس سے یہ عمل سرزد ہوتا تب اس کے اخلاقی نشوونما کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا۔

اسی لیے اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کی پُرزور تلقین کی اور بتایا کہ نیکی حاصل نہیں ہو سکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت انسان میں راسخ نہ ہو جائے۔ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔

گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر اسلام انسان کے اخلاقی احساس کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دنیا کی ملامت وسرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت ودستگیری کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔ مسلمانوں کی شناخت بتلاتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اُس میں سے راہ خدا میں صرف کرتے ہیں)، وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (وہ لوگ جو اپنے مال کو ظاہر اور پوشیدہ طور سے خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں)۔ پورا قرآن دیکھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ زکوٰۃ اور نماز کے بعد اگر کسی عمل کی بہ تکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ لیکن انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے۔ جس جماعت میں انفاق کی روح کام کر رہی ہوگی اس میں غربت وافلاس اور درد ومصیبت کی صدائیں مشکل سے سنی جا سکیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری، محتاجوں کی اعانت، یتیموں کی خبرگیری اور اقرباء کی ہمدردی کا جذبہ برسرکار ہوگا وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت پیدا ہی نہ ہوگی۔ جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں گی وہاں گردش زر Circulation of money میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہوگی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند رہے گا۔ کیونکہ دنیا کے اکثر وبیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردش زر جتنی مکمل ہوگی معاشی زندگی اتنی ہی پرسکون ہوگی۔

اس طرح معاشی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو اس کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں اور اس میدان میں وہ اشتراکیت سے اس کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام معاشی مساوات (Economic equality) سے زیادہ معاشرتی مساوات (Social equality) کا حامی اور موید ہے۔ معاشی مساوات اسے صرف اس حد تک مطلوب ہے کہ اجتماعی دولت کسی خاص طبقہ میں محدود نہ ہونے پائے۔ بلکہ جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہو اور ہر شخص کو اتنی روزی ضرور میسر آجائے کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ابتدائی ضروریات پوری کر سکے۔ اشتراکیت

کی طرح اسلام یہ نہیں چاہتا ہے کہ جملہ افراد معاشی حیثیت سے یکساں حالت میں ہوں یا معاشی زندگی کی اونچ نیچ بالکل ہموار اور ہم سطح ہو جائے۔ وہ ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے اور معاشی نامساوات کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا ہے بشرطیکہ یہ نامساوات ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ البتہ جس چیز کو وہ یکسر مٹا دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ دولت یا تموّل کی بنا پر افراد کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق و امتیاز پیدا ہو یا دولت ہی عزت کا واحد معیار ہو جائے۔ اس معاملہ میں اس کی راہ بالکل الگ ہے چنانچہ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہی ہے جس کے دل میں سب سے زیادہ اس کا خوف ہو وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنے آیا ہے جس میں دولت، علم، ہنر، عہدہ، نسل یا خاندان کوئی بھی عزت کا معیار نہ ہو اور جہاں فرق و امتیاز کی صرف ایک وجہ تسلیم کی جائے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خدا ترسی اور خدا پرستی میں کیا درجہ حاصل ہے۔

معاشرتی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے نماز با جماعت کو ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے یہ ایک بڑا نفسیاتی حربہ ہے جس سے وہ اپنے پیروؤں میں معاشرتی مساوات اور اخوت کی رُوح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز با جماعت کے التزام سے معاشرتی امتیازات پر ایک کاری ضرب پڑتی ہے۔ مندروں میں یکے بعد دیگرے پوجا پاٹ کرنے یا کلیساؤں میں ہفتہ میں ایک روز کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ کر عبادت کرنے سے اخوت و مساوات کا وہ احساس پیدا نہیں ہوتا جو مسجدیں روزانہ پانچ وقت ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ کسی مقام کے تمام مسلمان بلا فرق و امتیاز روزانہ پانچوں وقت مسجد میں اس طرح جمع ہوں اور پھر بھی ان میں باہم وہ بُعد و فصل باقی رہے جو معاشی درجہ بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو آجکل ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اہلِ ثروت اور اونچے طبقے کے لوگ اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو مساجد میں جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا اپنے مکان کے کسی گوشہ میں۔ عیدین اور جمعہ کے موقع پر تو وہ البتہ مسجد میں نظر آتے ہیں مگر روزانہ پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ان کی صورت مسجد میں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ

یہی ہے کہ اگر وہ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز ادا کرنا شروع کریں تو پھر وہ اپنے امتیازات اور معاشرتی مرتبہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرتی مساوات کا قیام معاشی مساوات کے حصول سے کہیں زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ کیونکہ معاشی مساوات کے حصول کے بعد بھی طبقہ واریت Class-stratification پیدا ہو سکتی ہے۔ اشتراکیت نے انسانی زندگی کے اس نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا کہ طبقاتی امتیازات مختلف شکلوں میں ظہور کر سکتے ہیں۔ طبقہ واریت تنہا دولت اور معاش کی راہوں سے نہیں آتی ہے۔ دوسری راہوں سے بھی اس مہلک مرض کا پھیلنا ممکن ہے۔ اس کا قوی احتمال ہے کہ انسان معاشی حیثیت سے تو ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں لیکن نسل، خاندان، عہدے یا اور کسی اعزاز کی بنا پر اُن میں امتیازات پیدا ہو جائیں۔ اس صورتِ حال کی مثالیں ہمیں ہندوؤں کی معاشرت میں بکثرت ملتی ہیں جہاں برہمنیت کسی معاشی مفاد پر نہیں بلکہ مذہبی اقتدار پر مبنی ہے۔ اسی طرح چھتریوں نے اپنی ایک علیحدہ معاشرت بنالی ہے۔ ساہوکار اور تجار مالدار ہونے کے باوجود برہمنوں اور چھتریوں سے کمتر درجہ رکھتے ہیں۔ اشتراکیت کے قیام کے بعد بھی ممکن ہے کہ طبقہ واریت کسی اور شکل میں نمودار ہو جائے۔ کسان اور مزدور، عالم اور عامی، پرولتاریہ اور اشتراکی حکمرانوں کے مابین طبقاتی امتیازات اور معاشرتی درجہ بندیوں کے حدود فاصل قائم ہو جائیں۔ اور معاشی حیثیت سے یکساں ہونے کے باوجود ان کے آدابِ معاشرت میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ اسی صورتِ حال کو دفع کرنے کی غرض سے اسلام نے اجتماعی عبادات کا نظام تیار کیا ہے تاکہ مسلمانوں میں باہم کوئی ایسا فرق و امتیاز نہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشترک نصب العین کے مطابق زندگی نہ بسر کر سکیں یا ان کے معاشرتی اختلافات سیاسی اور مذہبی اختلافات کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

مطبوعات

سیرت سید احمد شہید | مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی۔ ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے۔ پتہ:۔ محمد معین الدہر صاحب، نمبر ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ۔

اس کے پہلے ایڈیشن پر ان صفحات میں اس سے قبل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ نہایت مسرت کی بات ہے کہ طبع دوم کی نوبت جلد ہی آگئی، اور اس سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ فاضل مولف نے اس دوسری اشاعت کو پہلے سے زیادہ مفصل، پُر از معلومات اور مفید مباحث پر مشتمل بنا دیا ہے۔ اب سے سوا سو برس پہلے اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے جو عظیم الشان تحریک حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہما اللہ کی سرکردگی میں اٹھی تھی اور جس نے تمام ہندوستان، بلکہ آس پاس کے ممالک تک میں روح اسلامی کی ایک زبردست لہر پھیلا دی تھی، اس کے متعلق پہلی مرتبہ اتنی تفصیلی معلومات اس قدر مستند ذرائع سے اردو زبان میں فراہم ہوئی ہیں۔ امید ہے کہ اس کا مطالعہ متعدد حیثیات سے مفید ثابت ہوگا، اور خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ اس سے بہت فائدہ اٹھائیں گے جو اسی مقصد عزیز کے لیے پھر ایک مرتبہ سعی کرنا چاہتے ہیں۔

مگر مولف کے کام کی پوری پوری قدر کرنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی اس تحریک کے اسباب اور اس کے نظام اور طریق عمل، اور اس کی کامیابیوں اور ناکامی کے اسباب، اور اس کے قوی اور کمزور پہلوؤں کے متعلق بہت کچھ مزید معلومات کی تلاش و جستجو ضروری ہے۔ نیز اس ذخیرۂ معلومات کو پوری طرح مفید بنانے کے لیے اس امر کی بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسے بالکل سائنٹفک طریقہ پر مرتب کیا جائے اور تاریخ کے ایک محقق طالب علم کی طرح واقعات پر بے لاگ تنقید کی جائے۔ اگر ہمیں اپنے اسلاف کے کاموں اور ان کے تجربات سے اپنے حال کی اصلاح اور مستقبل کی تعمیر کے لیے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے تو سوانح نگاری کے

قدیم طرز میں کافی ترمیم کر کے عقیدتمندی کے عنصر کو کم اور تنقید و تحقیق کے عنصر کو بڑھانا پڑے گا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک | مولانا عبید اللہ سندھی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ قسم اول ؏۔ کتاب خانہ پنجاب، لاہور۔

اس کتاب میں مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے اتباع کی مساعی انقلاب و اصلاح کا ایک مجمل تاریخی نقشہ پیش کیا ہے جس میں شاہ صاحب کے ظہور سے لے کر جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کے قیام تک کی تاریخ بالکل ایک نئے رنگ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ مولانا کا اصل بیان مجمل ہے جس سے ان کا مدعا پوری طرح واضح نہیں ہوتا، مگر حاشیہ پر ان کے تلمیذ رشید مولانا نور الحق صاحب علوی کی تشریحات مفصل ہیں جن سے مولانا کے بیان کو سمجھنے میں کافی مدد مل جاتی ہے۔ جہاں تک مولانا سندھی کی ذات کا تعلق ہے، کوئی شخص خواہ ان سے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہو، بہرحال ان کے علم و فضل اور ان کی وسعتِ نظر اور ذکاوت وجودت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ ان کے قلم سے نکلا ہے اور جو کچھ اُن سے استفادہ کر کے مولانا نور الحق صاحب نے لکھا ہے وہ بہت سے لطیف علمی نکات اور بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے جن کی قدر نہ کرنا ظلم ہو گا۔ لیکن بحیثیت مجموعی جب ہم اس کتاب کو دیکھتے ہیں تو اس میں تاریخ کم اور تاریخ سازی زیادہ نظر آتی ہے۔ اگر عالم برزخ میں شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبد العزیز صاحب اور اس سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کو جمع کر کے یہ کتاب ان کے سامنے پیش کی جائے تو بعید نہیں کہ اپنے کارناموں کے اس مرقع کو دیکھ کر وہ حضرات خود بھی دنگ رہ جائیں۔ "حزب ولی اللہی" کا جو نظام اور پروگرام بیان کیا گیا ہے، اور معاصر تاریخ کے واقعات سے اس "حزب" کا تعلق جس طرح دکھایا گیا ہے اس کی بیشتر تفصیلات کے لیے غالباً قیاس کے سوا کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔ رہے اس "حزب" کے اساسی نظریات، تو ان کی جو تعبیر مولانا نے اور ان کے فاضل شارح نے پیش کی ہے اس کے بعض اجزاء کو معنیً صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے مگر بیشتر اجزاء تعبیر و تفسیر کی حد سے متجاوز ہیں۔ ماضی کے واقعات کو جدید طرز پر مرتب کرنا، یا بزرگانِ سلف کے کام کو جدید اصطلاحات

میں بیان کرنا بجائے خود کوئی گناہ نہیں، لیکن اس ترتیب بیان میں ایسے تصورات و نظریات کو داخل کر دینا جو اصلاً وہاں نہ تھے، ہمارے نزدیک کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ آخر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ اپنے تصورات کو ہم خود اپنے ہی تصورات کی حیثیت سے پیش کریں؟ اگلوں کے کام میں ان کا سُراغ لگانے کی کیا ضرورت؟

"حزبِ ولی اللہی" کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا نے حضرت سید احمد بریلوی اور ان کے متبعین کی صادق پوری جماعت کو جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ اُس رنگ سے بہت مختلف ہے جس میں حضرت سید احمد کے معتقدین پیش کرتے ہیں۔ ان دو مختلف بیانات میں ایک ایک عنصر صداقت کا بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن دونوں طرف مبالغہ کی رنگ آمیزی بھی اچھی خاصی نظر آتی ہے۔ ضرورت ہے کہ تاریخ کا ایک بے لاگ طالب علم اصل مآخذ کی چھان بین کرکے حقیقت کو جیسی کہ وہ فی الواقع تھی، جوں کا توں بیان کرے۔

اس "حزب" کی پوری تاریخ میں مولانا نے اگر کسی کوتاہی کی نشان دہی کی ہے تو وہ صرف حضرت سید احمد اور ان کے پوربی متبعین کے طرز عمل سے متعلق ہے۔ اس حصہ کو مستثنیٰ کرکے وہ اس حزب کو بے عیب معیار حق کی حیثیت سے پیش فرماتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسی حزب کے اتباع میں حق اور راستی دائر و منحصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تحزّب کا اقتضا یہی ہے کہ آدمی اپنی پارٹی کو اسی طرح پیش کرے۔ لیکن ہم اس حزب کے ایک ایک بزرگ کی خاکِ پا کو سُرمۂ چشم بنانے کے باوجود نہ تو یہ بات تسلیم کرسکتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی غلطی و خامی سے پاک تھا، نہ یہ مان سکتے ہیں کہ جس قدر روشنی ہم کو ان کے علوم میں ملتی ہے بس وہی ہمارے لیے کافی ہے، اور نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ ہدایت و رہنمائی کے لیے صرف اسی حزب کو واحد سرچشمہ تسلیم کرلیں۔ ہمیں اگر فی الواقع دینِ اسلام کو از سرِ نو ایک عالمگیر طاقت بنانا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ۱۳ سو برس کی طویل تاریخ میں دنیائے اسلام نے علم و عمل کے جس قدر بہترین نمونے پیش کیے ہیں ان سب کے فوائد اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کریں، اور قرآن و سنت کی روشنی میں ماضی و حال دونوں کو خوب دیکھ کر اور سمجھ کر خود اپنی ایک مستقل فکر پیدا کریں۔

خـــالی صفحـــه

TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM

BY

SAYYID ABUL-ALA MAUDUDI

This small book is an attempt at a clear and concise interpretation of Islam. The chief aim in view has been to present within a brief space the most systematic and logical conception of Islam to build a coherent and organic structure of human life on the basis of this conception and to give a comprehensive and lucid account of what this religion in reality is.

All the prominent journals and Dailies of India have highly spoken of this little book. Order your copy just now.

Price 1-8-0

رسالۂ دینیات

رسالۂ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلیے لکھا گیا ہے۔ اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اِسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اِس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اِس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۲؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجئے

صرف سرورق یونین پریس ہل روڈ لاہور میں طبع ہوا